یارِ رسولؐ اور غارِ ثور
مصنف عبدالکریم مشتاق

فہرست

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ فَقَدۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذۡ اَخۡرَجَهُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا ثَانِیَ اثۡنَیۡنِ اِذۡ هُمَا فِی الۡغَارِ اِذۡ یَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِیۡنَتَهٗ عَلَیۡهِ وَاَیَّدَهٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوا السُّفۡلٰی ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الۡعُلۡیَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِیۡزٌ حَكِیۡمٌ ۝

اگر تم (اے مسلمانو!) اس رسولؐ کی مدد نہ کرو (تو کچھ پرواہ نہیں، خدا مددگار ہے) اس نے تو اپنے (رسولؐ) کی اس وقت مدد کی جب کفار (مکہ) نے (گھر سے) نکال باہر کیا۔ (اس وقت وہ صرف دو آدمی تھے اور) اور دوسرے (رسولؐ) تھے۔ جب وہ دونوں (غارِ ثور) غار میں تھے جب وہ (رسولؐ) اپنے ساتھی کو (اس کی گریہ زاری پر) سمجھا رہے تھے کہ خوفزدہ نہ ہو اللہ یقیناً ہمارے ساتھ ہے۔ اور اللہ نے اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی (رسولؐ پر) اور ایسے لشکر (غیبی) سے آپؐ کی مدد کی جن کو تم لوگوں نے دیکھا تک نہیں اور خدا نے کافروں کی بات نیچی کر دکھائی اور خدا ہی کا بول بالا ہے۔ اور اللہ تو عزیز و حکیم ہے۔

(سورۂ توبہ آیت نمبر ۴۰ پارہ نمبر ۱۰)

سرورِ دو عالم، سیّد المہاجرین والانصار، محسنِ عالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہوں جن کی نصرت اللہ نے اس وقت فرمائی جب وہ عالمِ غربت میں اپنے ساتھی کی ڈھارس باندھ رہے تھے!

ابتدائیہ

اللہ رحیم ورحمان ہی لائقِ حمدِ خاص اور مستحقِ ثنا و توصیف ہے کہ اُس نے انتظامِ کائنات کو اپنی قدرتِ خاص سے جاری کیا۔ تمام مخلوقات میں سے بنی آدم پر اپنے کرم کی خصوصی نوازش فرمائی۔ پھر نوعِ انسانی میں مدارج و مراتب کے لحاظ سے طبقات بنائے۔ ان میں بعض کو بعض پر اپنے تفضّل سے فوقیت بخشی۔ اس افضل گروہ میں بھی خصوصیات کا لحاظ فرماتے ہوئے درجہ بندی کر دی اور اپنی مصلحت کے تحت قلّت کو کثرت پر سبقت دی۔ اپنے لطفِ خاص سے جسے موزوں سمجھا افضل بنایا اور مفضول پر اس کی اطاعت واجب قرار دی۔ اس انتخاب میں نہ ہی اُسے کسی رائے شماری کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہی کسی شورائی مجلس یا اجماع کی احتیاج درپیش آئی۔ پس اپنے علم و حکمت کے تحت اس ذاتِ علیم و حکیم نے ہر عہدۂ ھدایت پر اہل افراد کو مقرر کر کے مخلوق کو ہدایت پہنچانے کی ذمہ داری خود قبول کر لی۔ اور انسان کو باوجود بخششِ کمالات اور عطائے قوت و ادراک کے یہ اختیار تفویض نہ فرمایا کہ وہ اپنی صوابدید سے اپنا ہادی مقرر کر کے اس کی بیعتِ اطاعت منظور کرے۔ پس انسان کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ فلاحِ انسانیت کا متمنّی ہے تو وہ خدا کے مقرّر کردہ ہادی سے ہدایت حاصل کرے اور اپنے قیاسی عمل و دخل سے اجتناب کرے۔ کیونکہ تاریخِ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا میں پیدا شدہ اضطرابی کیفیت کی اوّلین بلکہ اصلی وجہ محض یہی ہے کہ لوگوں نے اللہ کے مقرّر کردہ ہادیوں سے تعلیم حاصل کرنے کی بجائے اپنے ذاتی واختراعی نظریات پر بھروسہ کیا۔ اگر دنیا خدائی نمائندگان کی اتباع کرتی تو آج یہ حالتِ زار

ہرگز پیدا نہ ہوتی۔

چونکہ عام انسانی علوم ناقص ثابت ہوئے ہیں اور انسان ہر قدم پر وحی کا محتاج ہی پایا گیا ہے اس لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہرگز ممکن نہیں ہے کہ تمام مصنوعی افکار اور خودساختہ نظریات سے لاتعلقی اختیار کر کے اپنے خالق حقیقی کی جانب خلوصِ نیت سے رجوع کیا جائے اور اس کی نازل کردہ ہدایات کی روشنی میں اپنے تمام مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ جب ہم اس حقیقت کے سامنے سر جھکائیں گے تو ہمارا سر دیگر اقوام کے مقابلے میں اس قدر بلند ہوگا کہ جسے کبھی نیچا نہ ہو سکے گا۔

یہ بات ہر زبان پر ہے کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ لیکن یہ بات حلق سے نیچے نہیں جاتی ہے کیونکہ عملاً اس کا کوئی معتبر ثبوت پیش نہیں کیا گیا جس سے باغی اذہان کی تشفی ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں لوگ لفظ "مساوات" میں بہت دلکشی پاتے ہیں۔ اور دنیا کا زیادہ جھکاؤ اسی طرف ہے کہ سب لوگ برابر ہیں۔ حتیٰ کہ اہلِ اسلام نے بھی مجبور ہو کر گھٹنے ٹیک دئے ہیں اور کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام بھی مساوات کا درس دیتا ہے بلکہ اب تو ایک نئی اصطلاح نے بھی جنم لیا ہے کہ "اسلامی مساوات"۔

اس میں شک نہیں کہ مزعومہ "مساوات" اور "اسلام" کا آپس میں قطعی کوئی رشتہ نہیں ہے کیونکہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ مذہبِ عقل و دانش ہے۔ اس کی تعلیمات کا انحصار "عدل" پر ہے۔ وہ قدم قدم پر غیر عادلانہ مساوات کی مخالفت کرتا ہے۔ اسلام ہرگز یکسانیت کو برداشت نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اسلامی تعلیم بات بات پر امتیاز کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ دینِ الٰہی ہے۔ اس میں قطعی طور پر یہ گنجائش موجود نہیں ہے کہ "نیک اور بد" کو برابر قرار دے "جنتی و بدکار"

کو ایک ہی مرتبہ دے۔ "بزرگ و عزیز" میں فرق روا رکھے۔ زیادہ سے زیادہ اگر اسلامی نظام میں مساوات سے مشابہ کوئی امر دکھائی دیتا ہے تو وہ یہ کہ اس کے قوانین کا اطلاق سب کے لئے یکساں ہے۔ اس کے فوائد میں پورا معاشرہ برابر کا شریک ہے۔ اسلام نہ ہی ایسی آزادی کو پسند کرتا ہے جس کے معنی بے لگام ہونا ہے اور نہ ہی ایسی مساوات چاہتا ہے جس میں افضل و مفضول برابر ہو جائیں۔ اسلام کی اساس محض "عدل" پر ہے کہ وہ کسی بھی پہلو سے ظلم برداشت نہیں کرتا ہے۔

میرا موضوعِ سخن عدل و مساوات نہیں ہے بلکہ مجھے واقعہ ہجرت کے ایک منظر پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ یہ ابتدائی معروضات اس لئے پیشِ خدمت کئے ہیں کہ اسلام نے مسئلہ تفضیل پر کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے اور اس مسئلہ پر مسلمانوں میں صدیوں سے طبع آزمائیاں جاری ہیں۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ افضلیت منجانب خدا حاصل ہوتی ہے جیسے انبیاء کو قدرتی فضیلت ہے کہ وہ اپنی اُمّت سے افضل ہیں۔ اسی طرح حضورؐ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپؐ تمام انبیاء و مرسلین سے افضل ہیں۔ اور آپؐ کے خلفائے برحق بھی بعد از رسول اکرمؐ تمام مخلوقات میں افضل ہیں۔ عالمِ اسلام میں حضورؐ کی فضیلت مسلّمہ ہے۔ مگر آپؐ کے بعد مسئلہ تفضیل میں اُمّت کا اختلاف ہے۔ بعض لوگ بعد از رسولؐ حضرت ابوبکر کے افضل ہونے کے قائل ہیں اور بعض کے نزدیک حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام۔

وہ جماعت جو حضرت ابوبکر کے افضل ہونے کی معتقد ہے وہ ان کی افضلیت کی بحث میں واقعہ ہجرت میں آپ کی رفاقت کو افضلیت کی ایک دلیل پیش کرتی ہے۔ کتاب ہذا میں اسی دلیل پر مختلف گوشوں سے بحث کر کے فریقین کے موقف کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر

کی یہ رفاقت افضلیت کے لئے دلیل قرار نہیں پا سکتی ہے۔

اصل مضمون سے پہلے ہم نے تمہیداً مسئلہ تفضیل پر مختصراً مگر جامع روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ہر گوشہ فضیلت کے اعتبار سے بعد از اشرف الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔ اور آپؑ کی افضلیت سے انکار کرنا دانش مندی کے خلاف ہے۔ چنانچہ سرکار سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگاہ فرما چکے ہیں کہ

"علؑی کو نہیں پہچانا مگر خدا نے اور میں (محمدؐ) نے"

پس یہ قولِ رسولؐ فیصلہ کن ہے کہ خود حضرت ابوبکر کو بھی حضرت علیؑ کی حقیقی معرفت ہرگز نہ تھی۔ لہٰذا وہ افضل کس طرح قرار پا سکتے ہیں؟

عبدالکریم مشتاق

مسئلہ تفضیل

کسی شخص کی افضلیت کے تعین کے لئے علماء نے دو طریقے بتلائے ہیں اوّل خدا اور رسول خدا کی طرف سے نص ہو اور دوم اس شخص کے اعمال و خدمات کا جائزہ لینا جس کے بنا پر وہ افضل قرار پاتا ہے چنانچہ سنی علامہ مفتی محمد غلام سرور قادری صاحب نے اپنی کتاب "افضلیت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ" میں افضلیت کی بنیاد سات اعمال پر منحصر بتائی ہے موصوف تحریر کرتے ہیں کہ،

"محققین اسلام و مفکرین شریعت نے افضلیت کی بنیاد سات عملوں پر رکھی ہے۔ جہاد[1]۔ علوم عامہ[2]۔ علوم قرآنیہ[3]۔ تقوی[4] و اتباع شریعت۔ زہد[5]۔ صدقہ و انفاق فی سبیل اللہ[6]۔ حسن سیاست[7]۔ افضل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام امور میں سب سے بڑھ کر ہو۔"

(ص ۵۵ کتاب مذکورہ)

اہل سنت والجماعت علامہ صاحب کے بیان کردہ ان اعمال کے تحت اگر حضرت علیؑ اور حضرت ابوبکر کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو جناب امیر علیہ السلام ان تمام امور میں حضرت ابوبکر سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے ثابت ہوتے ہیں پھر کوئی وجہ معقول نظر نہیں آتی کہ آپ کی افضلیت سے انکار کر کے حق سے چشم پوشی کی جائے۔ چنانچہ ہم ہر امر میں ایک سطحی موازنہ پیش خدمت کر کے قارئین کو دعوت غور و فکر دیتے ہیں کہ وہ اپنا دانشمندانہ اور محققانہ فیصلہ اخذ فرماسکیں۔

ہمارے نزدیک حضرت ابوبکر کی فضیلت محض ظنی ہے یقینی نہیں۔ اور ظاہر ہے یقین بجائے خود ظن سے افضل و بالا ہے۔ مقدمہ افضلیت یہ ہے کہ فضیلت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص کو باعتبار کسی خاص صفت یا بوجہ

مختلف صفات مختلفہ کے ترجیح دینا۔ اور افضل کُل وہ ہے جو ہر طرح کی فضیلت وا وصاف حمیدہ کا جامع ہو۔ اور جزوی فضیلت وہ ہے جو اپنے مقابل ہم رُتبہ سے کسی خاص صفت میں ممتاز ہو۔ شخص فاضل کا رتبہ دنیا و آخرت میں مفضول کے درجہ سے بلند ہوتا ہے۔ اور فاضل کی تعظیم و تکریم مفضول پر واجب ہوتی ہے۔ افضلیت یا تو خداداد ہوتی ہے یا انسان اپنے کسب کمال سے حاصل کرتا ہے جسمانی یا روحانی طور پر ریاضت کر کے خاص درجہ حاصل کرتا ہے۔ جب ہم فضیلت کے تمام گوشوں پر نظر اٹھاتے ہیں تو ہر راہ پر حضرت علی علیہ السلام کے ثبت کردہ قدموں کے نشانات بہت نمایاں دیکھتے ہیں۔

حضرت علیؑ اور حضرت ابو بکر کی افضلیت کا اختلاف شروع ہی سے چلا آرہا ہے اور مسلمان کسی ایک رائے پر متفق نہ ہو سکے۔ سُنی امام حضرت ابو حنیفہ سے پہلے علماء کی اکثریت حضرت علیؑ کو افضل تسلیم کرتی تھی مگر جابرانہ سلطنت کے رعب میں آکر ابو حنیفہ نے یہ ایک نیا عقیدہ گھڑا کہ افضل الناس بعد النبی ابو بکر ثم عمر ثم عثمان ثم علی (فقہ اکبر) جس کی تقلید میں فرق سنیہ پابند ہوئے۔ مگر پھر بھی سُنی علماء کی کثیر تعداد نے اس تقلید کو نظر انداز کرتے ہوئے افضلیت علیؑ المرتضیٰ کی تائید کی اور فضیلت شیخین کی نفی کی مثلاً

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا اقرار

"آنکہ تفضیل شیخین بر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ علیہم اجمعین من کل الوجوہ نیست بلکہ علماء محققین نوشتہ اند کہ تفضیل احد الشیخین علی الآخر من جمیع الوجوہ محال چہ تفضیل حضرت مرتضیٰ اعلیٰ درجہاد سیفی و سنانی و فن قضا و کثرت روایت و ہاشمیۃ و حیثیت لاشیما زو زوجیت حضرت بتول زہرا بر حضرت صدیق اکبر قطعی است۔ و ہمچنیں تفضیل آنجناب در قدم اسلام و اوّل من صلےٰ بودن بر حضرت فاروق نیز قطعی است ہے۔ (فتاویٰ عزیزی جلد اوّل صفحہ ۱۸۳ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

یعنی حضرات ابوبکر و عمر کی فضیلت جناب امیر علیہ السلام پر ہر پہلو و ہر طرح سے نہیں ہے بلکہ یہ علماء کے مطابق امر محال ہے کہ شیخین کو حضرت امیرؑ پر من کل الوجوہ افضل مانا جائے کیونکہ معاملہ جہاد تیغ و سناں اور فن قضایا اور کثرت روایات درشان امیر اور زوجیت فاطمہ زہرا وغیرہ ایسے امور ہیں جن کے باعث ان کی فضیلت حضرت ابوبکر پر قطعی طور پر ہے اور اور آپ کی اسلام لانے میں سبقت اور نماز پڑھنے میں اولیت حضرت عمر پر حضرت علیؑ کو قطعی طور پر افضل قرار دیتی ہیں۔

شاہ صاحب اسی جگہ پر آگے فرماتے ہیں اس قسم کی تفضیلی امامت حضرت علیؑ کے لئے علمائے اہل سنتہ اور صوفیاء کے نزدیک جائز ہے۔ جیسا کہ محدث عبدالرزاق، سلمان فارسی، حسان بن ثابت اور بعض دیگر صحابہ کا مذہب یہی تھا۔

علامہ ابن عبدالبر کا اعتراف

سنی علامہ ابن عبدالبر تحریر فرماتے ہیں کہ سلف الصالحین کا افضلیت حضرت ابوبکر اور حضرت علی میں اختلاف ہے۔ حضرات سلمان فارسی، ابوذر غفاری، عمار بن یاسر، خباب، حذیفہ یمانی، ابوسعید خدری، زید بن ارقم کا اعتقاد تھا کہ حضرت علیؑ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان سے افضل تھے اور ان سے پہلے اسلام لائے تھے۔

(استیعاب فی معرفتہ الاصحاب)

علامہ ابن حجر مکی کی رائے

موید و قوی قول علامہ ابن عبدالبر کا استیعاب میں یہ ہے کہ انہوں نے عبدالرزاق سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خبر دی ہے کہ زمانہ اصحاب میں اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ حضرت عمر حضرت ابوبکر سے افضل تھے۔ تو وہ اس کی ملامت کرتے اور اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ علیؑ ابوبکر سے افضل ہیں تو اس

کی ملامت نہ کرتے۔ اسی طرح ابن حجر لکھتے ہیں کہ خطابی نے بعض مشائخ سے خود روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا ابوبکر خیر ہیں اور علی افضل ہیں۔

(صواعق محرقہ فارسی مطبوعہ لاہور ص۱۱۸)

علامہ ابن حجر مزید لکھتے ہیں کہ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سلمان، ابوذر، مقداد، حباب، جابر، ابوسعید خدری، زید بن ارقم سے مروی ہے کہ حضرت علیؑ سب سے پہلے اسلام لاتے اور اس جماعت مومنین مذکورہ نے کسی غیر کو حضرت علیؑ پر فضیلت نہ دی۔

(صواعق محرقہ فارسی مطبوعہ لاہور ص۱۱۹)

ملا علی قاری کا بیان

ہمارے بعض مشائخ فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر اچھے ہیں اور حضرت علیؑ افضل ہیں۔

(شرح فقہ اکبر ملا علی قاری حنفی مطبوعہ ہند پریس لاہور ص۸۴)

سفیان ثوری کا اظہار

ابونعیم کی اسناد سے مروی روایت از زید بن حسان کی بناء پر سفیان ثوری حضرت علیؑ کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پر فضیلت دیتے تھے۔

(صواعق محرقہ فارسی مطبوعہ لاہور ص۱۱۶)

اظہارِ عجز

شرح عقائد نسفی مطبوعہ یوسفی لکھنؤ ص۱۰۸ پر اہل سنۃ نے اپنے عجز کا اظہار بایں الفاظ کیا ہے کہ،

"جناب علی المرتضیٰ اللہ کے بندے اور مخلص اصحاب رسول اللہ صلعم کے تھے سلف میں یہی فرمان ہے۔ طرفین کے دلائل متعارض ہیں۔ اس مسئلہ افضلیت میں کوئی رائے نہیں قائم ہو سکتی اور اعمال سے تعلق نہیں۔ لیکن سلف حضرت عثمان پر حضرت علی کو فضیلت دیتے تھے۔"

اسی صفحہ کے حاشیہ پر ہے کہ "اکثر اہل سنۃ کا قول ہے کہ حضرت علیؑ حضرت عثمان سے افضل ہیںؓ اور بعض متاخرین نے توقف کیا ہے۔

افضلیت شیخین میں آج تک اجماع امت کوئی آیت کوئی حدیث صحیح پیش نہ کر سکا اور افضل الناس بعد النبی ابوبکر ثم عمر ثم عثمان کا ثبوت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلعم سے نہ دے سکا۔ علماء اہل سنت کے اقوال مختلف ہیں۔ بلکہ ہر ایک محقق اور منصف مزاج مسلمان آیات بینات اور احادیث سرورکائنات کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ افضل الناس بعد النبی حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں۔ کہ جناب امیرؑ کی شان قرابت، زہد و عبادت، سخاوت، شجاعت، جہاد فی سبیل اللہ، علمی فضیلت اسلامی خدمات کا کوئی بشر مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شارح عقائد نسفی نے حاشیہ ص۱۰۸ پر مجبور ہو کر اعتراف کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی افضلیت حضرت ابوبکر پر لازم ہے کیونکہ آپؑ کے کمالات واختصاص کرامات تواتر سے ثابت ہے۔

حضرات اہل سنت کے پاس حضرت ابوبکر کی افضلیت کے حق میں صرف ایک ہی دلیل ہے اور وہ اجماع ہے۔ لیکن افسوس ہے سنی علماء نے اس اجماع کو قطعی قبول نہیں کیا بلکہ ظنی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ علامہ وحید الزمان لکھتے ہیں :-

"اور اکثر اہل سنت نے کہا ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر افضل ہیں پھر حضرت عمر پھر حضرت عثمان یا حضرت علی یا حضرت عثمان اور اس عقیدہ پر شارع علیہ السلام سے کوئی قطعی دلیل نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی قطعی اجماع ہے بلکہ اجماع ظنی ہے۔"

(ھدیۃ المہدی جلد ۱ ص۹۴ مطبوعہ میور پریس دہلی، شرح مواقف ص۶۱۶)

امام احمد بن حنبل کا اعتراف

"احادیث سے جتنی فضیلت حضرت علیؑ کی ثابت ہوتی ہے کسی صحابی کی نہیں ہوتی۔"

(تاریخ الخلفاء علامہ جلال الدین سیوطی مطبوعہ زمیندار پریس لاہور ص۹۱)

امام حاکم نیشاپوری نے امام احمد حنبل سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ کے اصحاب میں کسی کے لئے اس قدر فضائل وارد نہیں ہوئے جس قدر حضرت علی کے لئے وارد ہوئے ہیں۔ اسمٰعیل بن اسحاق القاضی ابوعلی نیشاپوری اور امام احمد بن شعیب النسائی کا قول ہے کہ صحابہ میں سے کسی کی شان میں جناب علیؑ کی شان سے زیادہ احادیث جید اسانید کے ساتھ روایت نہیں ہوئیں۔ (ارجح المطالب)

بعض علماء کا یہ قول ہے کہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی میں باہم ایک دوسرے پر من جمیع الوجوہ فضیلت دینے میں کوئی نص قطعی وارد نہیں ہے۔ اور بغیر نص قطعی کے افضلیت من جمیع الوجوہ جو ایک اعتقادی بات ہے ثابت نہیں ہو سکتی۔ اور ایسی افضلیت پر اجماع کے منعقد ہونے میں کلام ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ابوبکر کی خلافت پر تمام صحابہ کا اجماع ہو گیا لیکن خلافت ایسی مستلزم نہیں ہے اور ہمارے مشائخ میں سے شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفا میں بہت زور سے شیخین کی افضلیت تمام صحابہ پر ثابت کی مگر سب اشارات و کنایات سے جو اعتقادات میں حجت نہیں ہو سکتیں۔ اور احادیث اور آیات کے اشارات متعارض ہیں مثلاً حدیث یا علی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ اور انما ولیکم اللہ سے حضرت علی کی تفضیل سب پر نکلتی ہے۔

(تیسیر القاری ترجمہ صحیح بخاری پ۱۴ ص۳۷)

جلال الدین سیوطی کا عقیدہ

علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ "حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن ربیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ میں علم کی پوری پختگی اور مضبوطی تھی اور تمام عشرہ مبشرہ (حضرات ثلاثہ ان میں شامل ہیں) پر آپ کو قدامت اسلام، دامادی رسول صلعم فقر و سنت و جرأت و سخاوت کی وجہ سے فضیلت ہے۔

تاریخ الخلفاء علامہ جلال الدین سیوطی ص۹۲ عربی مطبوعہ مصر)

امام غزالی کا مسلک

حجتہ الاسلام امام اہل سنتہ ابو حامد غزالی اپنے رسالتہ الغزالی میں علم لدنی کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"علم لدنی نبیوں کے واسطے ہے - اور ولایت حضرت خضر اور حضرت علی علیہ السلام کو حاصل ہے"

مجاہد کا قول

مجاہد کا قول ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک شخص نے پوچھا سبحان اللہ جناب امیرؑ کے فضائل کتنے ہیں میرا خیال ہے کہ تین ہزار ہوں گے - ابن عباسؓ نے فرمایا تین ہزار کیا تیس ہزار ہوں گے - پھر ابن عباس کہنے لگے - اگر دنیا کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی ہو جائیں اور انسان لکھنے والے اور جن حساب کرنیوالے ہوں تو بھی جناب علی علیہ السلام کے فضائل کو شمار نہ کر سکیں۔

(تذکرہ خواص الامتہ عربی علامہ سبط ابن جوزی صنہ عربی)

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی ابوبکر و عمر عثمان و علی
ہم مرتبہ ہیں یاران نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

کچھ عرصہ قبل مسئلہ تفضیل سے تنگ آکر جمہور اہل سنتہ والجماعتہ نے اپنے امام اعظم حضرت نعمان بن ثابت ابو حنیفہ کے مذہب کے خلاف ایک نیا عقیدہ وضع کیا اور اس کا پرچار خوب زور و شور سے کیا کہ چاروں یار ہم رتبہ اور برابر ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ یہ ترانے بڑی عمدہ موسیقی اور مسحور کن دھنوں کے ساتھ اکثر بجائے جاتے ہیں حالانکہ یہ عقیدہ عقل و نقل سے قطعی غلط اور باطل ہے کیونکہ اس مادی دنیا میں کوئی موجود شے مساوات کا درجہ نہیں رکھتی۔ بنی نوع انسان، حیوانات، نباتات، جمادات، بحر و بر، اجرام فلکی، ہر چیز میں فرق ہے۔

فرشتوں میں امین وحی حضرت جبرئیل علیہ السلام، انبیاء و مرسلین میں سیدنا و نبیّنا و شفیعنا مولانا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جوانانِ بہشت میں حضرات حسنین الشریفین امامین الشہیدین تمام دنیا و جہان کے اولین و آخرین۔ مستورات میں سیّدہ صدیقۃ الکبریٰ فاطمہ زہراؑ۔ حیوانات میں ناقہ حضرت صالحؑ۔ بھیڑ بکریوں میں دُنبہ فدیہ حضرت اسمٰعیلؑ، شہروں میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ۔ مساجد میں مسجد الحرام، پتھروں میں حجرِ اسود، مہینوں میں ماہِ رمضان، ایام ہفتہ میں روزِ جمعہ، عیدِ غدیر، روزِ عاشورہ، راتوں میں لیلۃ القدر، شبِ معراج و شبِ برات، پھولوں میں گُلِ گلاب، جمادات میں سونا اور اجرامِ فلکی میں شمس کو فضیلت ہے۔

جاہل اور عالم، مردہ و زندہ، پاک و پلید، منافق و مومن، اندھا و بینا، نار و نور، رذیل و شریف، کمزور و توانا، سیاہ و سفید، غریب و امیر، پاگل و عاقل، مشرک و مسلم، بھگوڑا اور حیدرِ کرار، عورت و مرد، دوزخ و بہشت، رنج و راحت، فقر و غنا، فاسق و زاہد، فاجر و عابد، بے وفا و جانثار، غدار و وفادار، مظلوم و ظالم کسی بھی حالت میں ہم مرتبہ اور برابر نہیں ہو سکتے۔ کائنات میں کوئی مادی شے ایک دوسرے کے برابر نہیں۔ ضرور کچھ نہ کچھ فرق ہے۔

انسانی بود و باش، تمدن و معاشرت، بول چال، رفتار و گفتار، خوراک و پوشاک، توہمات و خیالات، رنگ و روپ ایک دوسرے سے نہیں ملتے ہیں ہزاروں کوس کا فرق ہے۔ اہل یورپ، اہلیانِ افریقہ، عربی و عجمی، رومی و شامی، ہندی و تاتاری، چینی و جاپانی وغیرہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف و متضاد طبع ہیں جب تمام کارخانہ ہست و بود کا یہ حال ہے کہ قدم قدم پر فرق ہے تو تمام اصحاب النبی کس طرح ہم رتبہ ہو سکتے ہیں جبکہ خود انبیاء مرسلین علیہم السلام میں تفوق فضیلت ہے قولِ خدا ہے تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض دیکھئے۔ اور پھر چار یاروں کی برابری کے عقیدے کا موازنہ قرآن سے کرو خود ہی معلوم ہو گا کہ یہ انتہائی

جاہلانہ اور کورانہ عقیدہ ہے۔ ہر ایک شخص کے مراتب میں فرق ہے۔ سربراہ مملکت، وزراء، عمال، آفیسرز، کلرک، سپاہی، جرنیل وغیرہ وغیرہ سب کے اپنے اپنے درجات و مراتب ہیں۔ کوئی کسی کے برابر نہیں۔ اگر دنیا میں سب کو مساوات کا درجہ مل جاتا تو انتظام تمدن و معاشرت کا قائم رہنا امر محال ہوتا۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد ہم واپس مولوی مفتی علامہ غلام سرور قادری صاحب کے بیان کردہ سات اعمال کی طرف آتے ہیں اور مختصراً تقابلی جائزہ پیش کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام بعد از ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تمام مخلوقات سے من کل الوجوہ بڑھے ہوئے ہیں اس لئے وہ حضرت ابوبکر سے ہر لحاظ سے افضل ہیں اور اس سے انکار کرنا صرف تعصب یا غیر معقول و اندھی عقیدت کا نتیجہ ہے۔ یہ عقیدہ نہ ہی عقلاً قابل قبول ہے اور نہ ہی نقل اس کی تائید کرتی کیونکہ نص کا وجود قطعی نہیں محض ظنی ہے۔

جہاد میں حیدر کرار کی افضلیت

جہاد یقیناً و قطعاً معیار افضلیت ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرنے والے مجاہدین کا درجہ اپنے فضل سے بلند فرمایا ہے۔ اور اللہ نے سب سے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے اور مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر اجر عظیم سے فضیلت دی ہے اس کی طرف سے درجات اور مغفرت اور رحمت ہے ان مجاہدوں کے لئے اور اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔

(سورۂ نساء ۹۵)

اس کلام ربانی کے مفہوم سے صاف ظاہر ہے مجاہد کو غیر مجاہد پر فضیلت ہے اور جس مجاہد کا جہاد جس درجہ کمال پر ہوگا اسی نسبت و لحاظ سے وہ فضل کا مستحق قرار پائے گا۔ گو کہ اصطلاح اسلام میں جہاد کے معنی عام یہ ہیں کہ کفار و مشرکین و مخالفین دین کے خلاف ثابت قدمی سے جنگ کرنا لیکن جہاد کو بھی علماء نے تین قسموں

میں تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ مفتی سرور صاحب لکھتے ہیں کہ:

"ہم کہتے ہیں جہاد کی تین قسمیں ہیں ــــ اوّل: جہاد باللسان یعنی جہاد زبانی کہ اسلام کا پیغام پہنچانا۔ شریعت کے احکام سمجھانا اور وعظ و نصیحت کرنا۔ ترغیب و ترہیب اور حقانیت اسلام و صداقت مسلک پر دلائل قائم کر کے مخالفین کے شکوک و شبہات کو رفع کرنا ــــ دوسرا: وہ جہاد جو جنگ کے وقت ہوتا ہے مثلاً عمدہ تدابیر سوچنا اور اچھی رائے قائم کرنا۔ مخالف کے دلوں میں رعب ڈالنا عملی طور پر جنگ میں حصّہ لینے کے لئے مجاہدین تیار کرنا اور اپنی فوج کو بڑھانا اور مال و دولت خرچ کر کے آلاتِ جہاد فراہم کرنا اور فوج کے لئے مناسب سواریوں کا بندوبست کرنا اور طرح طرح کے منصوبوں سے مخالفین اسلام کی جمعیت کو منتشر کر کے ان کی اجتماعی قوّت کو کمزور کرنا ــــ تیسرا: جہاد بالید ــــ اور تلوار و بندوق ہاتھ میں لے کر میدانِ کارزار میں پہنچنا اور دست بدست لڑنا۔

اگر غور کیا جائے ــــ تو معلوم ہو گا کہ جہاد کی یہ تیسری قسم پہلی دو قسموں سے کم تر مرتبہ رکھتی ہے اور پہلی دو قسموں کے مقابلہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ آنحضرتؐ کو بھی جہاد کرنے کا حکم تھا۔ یعنی اے نبی محترمؐ کافروں اور منافقوں سے جہاد فرمائیے اور ان پر سختی کیجئے۔ اور دوسری جگہ آپؐ کو حکم ہوتا ہے یعنی اے نبی محترم اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑیئے۔

اور خوب روشن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے باوجود جہاد کی تیسری قسم سے بہ نفسِ نفیس مصروف نہیں ہوتے البتہ پہلی دونوں قسم کے جہادوں میں بہ نفسِ نفیس شامل و شاغل رہے۔ لہٰذا ہر صورت جہاد کے وہی دونوں قسم افضل و اعلیٰ ٹھہرے۔

اب انصاف سے دیکھا جائے تو حضرات شیخین جہاد کے ان دونوں قسموں میں تمام صحابہ سے پیش پیش رہے کیونکہ ابوبکر صدیقؓ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے سب سے پہلے اُمتی ہیں جنہوں نے اپنی دعوت پر سب سے پیشتر تبلیغ اسلام کا آغاز فرمایا۔ انہی کی تبلیغ سے اکابر و عمدہ صحابہ نے اسلام قبول کیا۔ آپ ہمیشہ اسی تبلیغ میں مصروف رہے اور اس سلسلہ میں زبردست مصائب برداشت کئے بلکہ آنحضرت صلعم کی مدافعت کرتے ہوتے قریش کے بے حد تشدد کا بار رہا نشانہ بنتے اور لہولہان ہوتے رہے۔"

(افضلیت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ص ۵۷-۵۶)

مفتی صاحب کا یہ بیان از خود اُن کے عجز کا اعتراف ہے کہ حضرت ابوبکر کو جہاد بالسیف میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں۔ اسی وجہ سے ان کو جہاد کی تعبیہ تاویلات وضع فرمانے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ اپنے ممدوح کے ناقص جہاد کی مدافعت کر سکیں۔ مفتی صاحب کی ساری محنت کو ہم ایک سوال میں بیکار ثابت کرتے ہیں کہ مذہب اہل سنت میں "جہاد" ایک رکن اسلام ہے۔ اس کی تعریف میں علماء نے لکھا ہے "جہاد ہر بالغ مرد پر فرض ہے جو استطاعت رکھے۔ عورتوں، ضعیفوں، بیماروں اور معذوران شرعی سے یہ فریضہ ساقط ہے۔" اگر حقیقی طور پر ہم جہاد کے بیان کردہ تین اقسام کو صحیح مانتے ہیں تو پھر اس تشریح اور توضیح کی وضاحت فرمائیں۔ جہاد باللسان اور جہاد بالتدبیر میں بظاہر کسی استثنا کا جواز معلوم نہیں ہوتا ہے۔

پھر یہ بات عقلاً انتہائی لغو قرار پاتی ہے کہ ایک شخص میدانِ کارزار میں اپنی جان نثار کرتا ہے۔ ہتھیاروں سے اذیت اٹھاتا ہے۔ زخموں کی تکلیف برداشت کرتا ہے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں ثابت قدمی سے جہاد کرتا ہے۔ تو اس کی اس عظیم سرفروشی کو نظر انداز کر کے ایک ایسے شخص کو فضیلت دی جائے تو محض زبان تو چلاتا ہے مگر میدان میں آنے سے گریز کرتا ہے۔ دلی کا راستہ تو بتاتا ہے مگر راستے کا خرچہ پلے نہیں باندھتا ہے۔ لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل دینے کا مشورہ دیتا ہے مگر خود اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے۔ اب چونکہ یہ نظریہ سخت سنگدلی پر انحصار کرتا ہے اس لئے اسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مجاہد کی موت ہی کو شہادت کی زندگی کا انعام حاصل ہے اور سپاہی مجاہد ہی کو غازی کہا جاتا ہے۔ پس جہاد کی یہ اقسام مجازاً اور ضمناً تو زیرِ غور رکھی جاسکتی ہیں مگر حقیقی اعتبار سے نہیں۔ کیونکہ اکثر مقامات پر "جانوں" کے جہاد اور "مالوں کے جہاد" کا ذکر کیا گیا ہے مگر باتوں کے جہاد پر تاکید مفقود ہے۔ مقاتلے کی آیات قرآن میں وارد ہیں اور یہ لفظ جہاد اپنے لغوی معنی تبدیل کر کے مسلمانوں میں اس مفہوم سے اس قدر معروف ہو چکا ہے کہ جب کبھی "جہاد" کا لفظ استعمال ہوتا ہے فوراً توجہ اور ذہن میں جہاد بالسیف کا تصور ابھر آتا ہے۔ مفتی صاحب نے جو آیت سورۂ نسا سے اوپر نقل کی ہے اس میں بھی اللہ نے یہی فرمایا ہے کہ اُن مجاہدین کے درجات بلند ہیں جنہوں نے اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا نہ کہ بیٹھ رہنے والوں کے۔ پس اُن کی بیان کردہ اقسام کی بحث کو ہم ان کی نقل کردہ قرآنی آیت ہی سے رد کرتے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے جانوں اور مالوں سے جہاد کیا وہ ان لوگوں سے افضل و بلند ہیں جو بیٹھے رہے۔ باتیں کرتے رہے تدبیریں بتاتے رہے مگر عملی طور پر میدان میں آنے سے کتراتے رہے۔

مجھے افسوس ہے کہ مفتی صاحب اپنے ممدوح کی افضلیت بیانی کے نشہ میں اس قدر مدہوش ہیں کہ انہوں نے معاذ اللہ خود مجاہد اعظم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تحریر کر دیا کہ آپؐ نے بنفسِ نفیس کسی جہاد میں شمولیت اور مشغولیت نہ کی۔ یہ بات قطعاً خلاف واقعہ ہے اور مفتی صاحب کی قلتِ علمی یا تعصب پسندی کی علامت ہے حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بذاتِ خود ہر غزوہ میں شرکت فرمائی اور تمام بڑی بڑی لڑائیاں میں آپ خود ہتھیار باندھ کر شریک ہوئے۔ اور اس بات سے اسلام کا بچہ بچہ واقف ہے کہ غزوہ اُسی لڑائی کو کہتے ہیں جس میں حضور اکرمؐ شریک ہوئے۔ جنگِ احد میں حضورؐ کا ساتھ جب اصحاب نے چھوڑ دیا تو آپؐ کے

دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ حنین میں میدان میں ڈٹے رہے اور بھگوڑے ساتھیوں کو پکارتے رہے۔

الغرض ہم میدانی مجاہدین کے ماننے والے ہیں اور مفتی صاحب گھریلو مجاہدوں کے مداح ہیں۔ ہمارے لئے میدان کھلا ہے۔ ہم اُن کی یہ تین قسمیں بھی زیرِ بحث لاتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ان اقسام کے اعتبار سے بھی اُن کا ممدوح فضیلت کا حقدار نہیں ہے۔

جہاد باللسان

بقول مفتی صاحب اول قسم جہاد باللسان ہے کہ اسلام کا پیغام پہنچانا، شریعت کے احکام سمجھانا اور وعظ و نصیحت کرنا وغیرہ۔

اس قسم جہاد کے لئے ضروری ہے کہ مجاہد صاحب علم ہو۔ اور علم کا سب سے بڑا ماخذ قرآن مجید ہے۔ میرا عالم اسلام کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ کسی صحیح کتاب سے کوئی مرفوع و متواتر حدیث پیش کریں جس کے تمام راوی ثقہ ہوں جس میں یہ مرقوم ہو کہ حضرت ابوبکر حافظِ قرآن تھے۔ یا حضرت ابوبکر کا کوئی قول پیش کیا جائے جس میں اُنہوں نے عالم القرآن ہونے کا دعویٰ اپنی زبان سے کیا ہو۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسائل میں آپ قاصر رہے۔ پس جب شریعت کے ماخذ اوّل ہی پر کامل دسترس نہ ہو تو پھر اس جہاد میں فضیلت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔

شہادت رسولؐ

اس کے برعکس حضرت علیؑ کے بارے فرمانِ رسولؐ ہے کہ "علی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ ہے۔" اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہونگے حتیٰ کہ حوض کوثر پر دونوں وارد نہ ہوں۔"

(طبرانی فی الاوسط۔ ارجح المطالب صد ۱۲۹)

عبداللہ بن مسعود کی گواہی

مشہور قاریٔ قرآن صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ میں نے ستر سورتیں رسول اللہ صلعم سے پڑھیں اور باقی سارا قرآن مجید تمام آدمیوں سے افضل شخص علیؑ سے ختم کیا۔

(اخرجہ الخوارزمی فی المناقب، طبرانی فی الکبیر ارجح المطالب ص۱۳۹)

حضرت عمر کا اعتراف

امام احمد بن حنبل نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ بتحقیق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؑ سے فرماتے تھے کہ تم مومنوں سے پہلے میرے ساتھ ایمان لانے والے ہو اور تم ان سب سے خدا کی آیتوں کے ساتھ زیادہ تر علم رکھنے والے ہو اور تم ان سب سے خدا کے عہد کو زیادہ تر پورا کرنے والے ہو اور سب سے رعیت کے ساتھ زیادہ مہربانی کرنے والے اور ان سب سے اللہ کے نزدیک عظیم منزلت والے ہو۔ (ارجح المطالب ص۱۳۹)

ذہبی نے تحریر کیا ہے کہ سعید بن عمر بن سعید العاص کہتا ہے کہ میں نے عبداللہ بن عیاش بن ابی ربیعہ سے کہا کہ آپ مجھے ابوبکر و علی کے مرتبوں سے خبردار کر دیں کیونکہ باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عمر رسیدہ ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سابق الاسلام ہونے کے پھر لوگ جناب علی کی طرف کیوں زیادہ میلان رکھتے تھے۔ عبداللہ بن عیاش نے کہا اے میرے بھتیجے ان کے پاس یعنی علی کے پاس جو کچھ کاٹنے والے دانت چاہیئے تھے موجود تھے۔ نسب کی فراخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرابت قریبہ اور علم بالقرآن اور جنگ میں شجاعت اور بخشش عطا کے ساتھ۔

(ارجح المطالب ص۱۴۰)

ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اور ابونعیم نے حلیۃ المتقین میں روایت کی ہے کہ محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ قرآن میں جو یہ آیت نازل ہوتی ہے جس کے معنی

یہ ہیں کہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے وہ علی ابن ابیطالب ہیں۔

(ارجح المطالب صفحہ ۱۲)

ان تمام مرویات سے حضرت علی علیہ السلام کا تمام مسلمانوں سے زیادہ عالم القرآن ہونا ثابت ہے۔ اس کے علاوہ خود حضرت امیر المومنین علیہ السلام منبر پر دعویٰ فرمایا کرتے تھے کہ "جو کچھ چاہو مجھ سے پوچھ لو"۔ جو ان کے عالم بے نظیر ہونے کا ثبوت ہے۔ پس جب حضرت امیر علیہ السلام کا علمی مرتبہ بلحاظ قرآن مجید حضرت ابوبکر سے بڑھا ہوا ہے تو کوئی وجہ انکار نہیں کہ اُن کی افضلیت ابوبکر پر تسلیم نہ کی جائے۔

حضرت علی علیہ السلام کی علمی متاع آج بھی دنیا میں فیض تقسیم کر رہی ہے۔ اُن کے کلام کو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بعد از قرآن کا درجہ حاصل ہے۔ مادی و روحانی علوم میں اُن کی ہدایات سے علمی تشنگی کی پیاس بجھتی ہے۔ جب کہ حضرت ابوبکر کا سرمایہ علمی کچھ بھی پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی شخص حضرت ابوبکر کی زبان سے "دین" کی تعریف بیان شدہ ثابت کر دے تو ہم اس کے معتقد ہو جائیں گے بشرطیکہ یہ قول صحاح ستہ میں سے صحیح اسناد سے نقل کیا جائے۔

جہاد بالتدبیر

تدبیر و منصوبہ بندی کے لئے علم و تجربہ درکار ہوگا۔ میدان جنگ کی تدابیر وہی شخص بہتر طریقے سے وضع کر سکے گا جو بذات خود مشاق سپاہی اور آزمودہ مجاہد ہو۔ ایک ایسا شخص جسے فن سپاہ گری و فوجداری اور حیلہ معرکہ آرائی سے واسطہ ہی نہ پڑا ہو اور اگر ایسا وقت آیا بھی ہو تو اس کی حیثیت کسی خصوصیت و اہمیت کی حامل نہ رہی ہو تو اس کی تدبیر پر غور نہیں کیا جا سکے گا۔ حضرت ابوبکر کو جنگی مہارت حاصل نہ تھی اور نہ ہی کسی جنگ میں قبل از اسلام یا بعد از اسلام اُن کے کسی نمایاں کردار کی خبر حاصل ہوتی ہے پس ایک ناواقفی

شخص کے لیئے یہ گمان کر لینا کہ وہ جنگی پالیسی کی وضعیت میں مشیر رہے گا۔
عقلِ سلیم کے خلاف بات ہے۔

پھر زمانہ پیغمبرؐ کے جہاد تمام تر احکامات وحی کے مطابق تھے اور
وحی کے مقابلے میں غیر معصوم مشاورت کا کوئی اقتدار نہیں ہے۔ مالی اعانت
کرنا بلاشبہ کارِ خیر ضرور ہے مگر جان مال سے افضل ہے جانی ایثار بہر حال
مالی ایثار پر فوقیت پاتا ہے۔

اب چونکہ حضرت ابوبکر کوئی نامی گرامی جنگجو سپاہی یا آزمودہ کار
پہلوان نہ تھے بلکہ الجثہ عمر رسیدہ تاجر ذہن آدمی تھے اس لئے جہاد
بالتدبیر میں ان کی افضلیت کا تذکرہ ہی غیر ضروری ہے۔ اس کے برعکس
حضرت حیدر کرارؑ کا جرّی مجاہد ہونا متفقہ امر ہے لہٰذا ان کی تدابیر بھی
ان کے عملی تجربات کی بنیاد پر اور جنگی مشاہدات کی اساس پر یقیناً حضرت
ابوبکر کی تدابیر پر فوق رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود اہل سنت اکثر کہا کرتے
ہیں کہ شیخین نے حضرت امیرؑ سے جنگی مشورے حاصل کیئے۔ اگر ان کے مشورے
ماہرانہ نہیں تھے تو پھر شیخین کو یہ احتیاج کیوں پیش آتی رہی۔ یہ محتاجی از خود
اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں
جناب امیر علیہ السّلام کو اپنے سے افضل مدبّرِ جنگ تسلیم کرتے تھے۔ اور ان
کے تجرباتِ حربی سے مستفید ہونے کے ممنون تھے۔

جہاد بالید

اس قسم کے جہاد کے معاملہ میں تو مفتی صاحب نے خود
ہی ہتھیار ڈال دیئے ہیں کہ اس میدان میں شیخین کے
اکھڑے ہوئے قدموں کے نشانات کے علاوہ اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔
جبکہ حیدر کرارؑ کا نعرۂ حیدری آج بھی میدانوں میں گونج کر جہاد علوی کی یاد
کو تازہ کئے ہوئے ہے۔ حضرت امیر المومنین کا جہاد تو بہت بڑی بات ہے
سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو صرف ایک ضربتِ حیدرؑ یہ کو

ثقلین کی عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔ چنانچہ دیلمی نے فردوس الاخبار میں روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے روز خندق عمرو بن عبدود کے ساتھ جناب علی ابن ابی طالب کے مقابلہ کرنے کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام اُن اعمال سے کہ قیامت تک میری امت کے لوگ کرتے رہیں گے علی کی یہ ایک ضربت افضل ہے۔ اسی طرح امام حاکم نے نقل کیا ہے کہ بہز بن حکیم اپنے والد سے ناقل ہیں کہ خندق کے دن جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا علی کا عمرو بن عبدود سے مقابلہ کرنا تمام ان اعمال سے کہ قیامت تک میری امت کے لوگ کریں گے افضل ہے۔

بارگاہِ رسالت میں عرض

میں غلام علیؑ یہاں بارگاہِ رسالت مآبؐ میں عرض کرتا ہوں کہ یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ کی امت میں حضرت ابوبکر بھی شامل ہیں لہٰذا اُن کے تمام اعمال بھی شامل کر کے آپ کی باقی تمام اُمت کے اعمال سمیت اگر آپؐ کے وصی علیؑ کی ایک ضربت کو افضلیت حاصل ہے تو پھر آپ کی اُمت کو یہ کیا حق ہے کہ حضرت ابوبکر کو حضرت علیؑ سے افضل قرار دیتی ہے۔ آپؐ کا حکم بھی نہیں مانتی اور پھر امت ہونے کا دعویٰ بھی جاری ہے!

لہٰذا مفتی صاحب سے یہی گذارش کروں گا حدیث ضربت آپ کے ہاں مشہور ہے اس کی صحت میں بھی کلام نہیں۔ اب ہم رسولؐ اللہ کی بات قبول کریں یا آپ کی خود ساختہ توضیحات پر کان دھریں۔ جب نبیؐ نے فیصلہ کر دیا کہ علیؑ کی ایک ضربت ساری اُمت کے اعمال سے افضل ہے تو پھر ایک اُمتی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس فیصلہ کو خلوص دل سے قبول کرنے سے گریز کرے یا تنگ دلی کا مظاہرہ کرے۔ پس آپ کے زعم میں حضرت ابوبکر کے اعمال لاکھ بھاری ہی مگر ارشاد پیغمبرؐ کے مطابق اس ضربت کے مخالف پلہ میں ہی جگہ پائیں گے اور حضرت علی علیہ السلام

کی دیگر خصوصیات تو رہیں ایک طرف ان کی صرف ایک ضربت روز خندق ان کو تمام اُمّت سے افضل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

اپنے مذہب کا بھرم قائم رکھنے کے لئے اور اپنے ممدوح کا وقار بحال کرنے کی خاطر مفتی صاحب نے اپنی بیان کردہ دو اقسام جہاد پر زور قلم صرف فرمایا اور چند موضوع روایات لکھی ہیں جن پر بحث کرنا اس کتاب کو طول دے گا۔ اور نفس مضمون سے متعارض ہو گا لہٰذا کسی اور موقع پر ان پر بھی گفتگو ہو گی تاہم ساکھ بچانے کے لئے مفتی صاحب نے یہ بھی تحریر کر دیا کہ

"تیسرے قسم کے جہاد کے لئے بھی جب کہیں فوج بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو اکثر و بیشتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی سردار و کمانڈر بنا کر بھیجا۔ (حاً اور آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے بارہا نہایت بے جگری سے کفار کے ساتھ دست بدست بھی لڑے) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی تیسرے قسم کے جہاد میں خوب حصہ لیا۔ (افضلیت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ صفحہ ۵۹)

مفتی صاحب نے کوئی تاریخی حوالہ اپنے بیان کی تائید میں پیش نہیں کیا ہے۔ لہٰذا وہ معرکے جن میں حضرت ابو بکر کو سردار بنایا گیا ہمارے علم میں نہیں ہیں اس لئے گذارش کرتے ہیں کہ وہ ان لڑائیوں کے نام بھی تحریر کر دیں۔ البتہ ہمیں معلوم ہے کہ جنگِ خیبر میں ان کو روانہ کیا گیا مگر وہ نامراد واپس آئے۔ اور ان کی زیرِ امارت فوج نے اپنے جرنیل کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی۔ شمس العلماء شبلی نعمانی تحریر کرتے ہیں:۔

"قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا۔ اس مہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو بھیجا۔ لیکن دونوں ناکام واپس آئے۔ طبری میں روایت ہے کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہ جم سکے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے

نامردی کی۔ لیکن فوزیہ نے ان کی نسبت خود ہی شکایت کی۔"
(سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۴۵)

ہم تو جانیں سیدھی بات، بازی ہوئی ابھی مات۔ کوئی بھی مداحِ ابوبکر کسی معتبر تاریخ سے جو پانچ سو سال قبل پہلے لکھی گئی ہو یہ ثابت کر دے کہ حضرت ابوبکر نے تمام غزوات میں صرف تین کافروں کو قتل کیا ان کے نام اور جنگ کا نام لکھ دیجیے۔ بس ہم مان لیں گے حضرت ابوبکر بڑے بہادر تھے۔

چلیے یہ کام ذرا مشکل ہے کوئی ہمیں صرف اتنا بتا دے کہ میدانِ جہاد میں حضرت ابوبکر کو کتنے زخم آئے اور کس کس جنگ میں کس مخالف کافر نے ان کو زخمی کیا۔ اگر ناکام رہیں تو مت بیرِ مولا کے ہاتھوں جہنم رسید ہونے والے ملعونوں کی فہرست خود ہی کتابوں میں سے مرتب کر کے ایمانی فیصلہ کر لیں کہ کس کا جہاد افضل تھا۔

حضرات شیخین کا جنگوں سے فرار کتب اہل سنت سے مکمل طور پر ثابت ہے۔ جسے شوق ہو میری کتاب "فروعِ دین" اور رسالہ "صدیق اکبر اور فاروق اعظم" کا مطالعہ کر کے اپنے شبہات رفع کر لے۔ کیونکہ اس کتاب کا نفسِ مضمون مجھے تفصیل کی اجازت نہیں دیتا ورنہ شواہد نقل کر دیتا کہ مفتی صاحب کے ممدوح نے کیسی دست بدست لڑائی کی اور کس طرح تیسرے قسم کے جہاد میں خوب حصہ لیا۔

الغرض حضرت علیؑ کا جہاد مسلمہ ہے اور فریقین نے اُن کی جنگی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے برعکس حضرت ابوبکر پر عدم استقامت، فرار، نامردی اور بزدلی کے الزام اتہام خود سُنی کتب میں مرقوم ہیں۔ لہٰذا مشکوک فرد کو درجہ افضلیت حاصل نہیں ہو سکتا۔

مفتی صاحب نے بزاز کے قول سے جو انہوں نے اپنی مسند میں حضرت علیؑ سے منسوب کیا ہے، یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر سب سے زیادہ بہادر تھے ۔۔۔۔ شرط یہ ہے کہ روایت منقولہ کے اسنادِ صحیحہ بھی نقل کیے جائیں۔

تھے۔ اس سلسلہ میں میری عرض یہی ہے کہ بزاز کا قول قطعاً غیر مستند ہے۔ کیونکہ یہ خلافِ واقعہ بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہجو کہی جاسکتی ہے۔

علومِ عامہ

علم یقیناً و قطعاً معیارِ افضلیت ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ کیا عالم اور جاہل برابر ہوسکتے ہیں؟ یعنی ہرگز نہیں ہوسکتے ہیں۔ حضرت امیرالمومنینؑ کے علم کا مرتبہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ عالم القرآن ہیں۔ آپؑ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ سارا علم بسم اللہ کی ب میں سمٹ جاتا ہے جب نقطے میں اور وہ نقطہ میں (علیؑ) ہوں۔ آپ کی تربیت آغوشِ مصطفیٰؐ میں ہوئی۔ حضورؐ نے آپؑ کو اس طرح تعلیم دی جس طرح پرندہ اپنے بچے کو خوراک دیتا ہے۔ کبھی آپؑ کو مدینۂ علم کا دروازہ کہا اور کبھی حکمت کے گھر کا باب۔ آپ کے خطبات، مکتوبات اور ارشادات و اشعار آج بھی دنیائے علم و عرفان کے لئے ہدایت و راہبری کے بلند مینار ہیں۔ کوئی گوشۂ علم ایسا نہیں جس پر آپ نے روشنی نہ ڈالی۔ علم طب و جراحی، علم کتب الہامی، تفسیر، علم القراۃ، علم الحدیث، علم فقہ، علم الفرائض، علم الکلام، علم اصول، علم تصوف، علم صرف و نحو، علم فصاحت و بلاغت، علم کتابت و خطابت، علم الشعر، علم الریاضی، علم ہیئت، علم تعبیر، علم الجفر، علم الجامعہ، علم اللدنی اور علم القرآن وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے اپنی کتاب "صفر ایک راستہ" میں بارہ علوم پر بحث کرکے ثابت کیا ہے کہ حضرت علیؑ سے بڑھ کر سوائے استادِ علیؑ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی مخلوق درجہ علم و عرفان پر فائز نہیں ہے۔ حضرت علیؑ کے لئے علم میں افضلیت من کل الوجوہ اس بات سے ثابت ہے کہ آپ نے کسی شخص خاکی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا ہے۔ روحانیت میں صوفیائے کرام اور فقرا نے آپ کو سرچشمہ علم و معرفت تسلیم کیا ہے۔ خود شیخین نے اپنے مسائل حضرت علی سے حل کروائے ہیں اور اقرار کیا ہے کہ اگر علی نہ ہوتے تو ہم ہلاکت

میں پڑ جاتے۔ اور آج کے زمانہ ترقی میں تمام اہلِ علم نے درِ علم کے سامنے اپنے سروں کو جھکاتے ہوتے برملا اعتراف کیا ہے کہ صدیوں سال پہلے جن حقائق کا اظہار تعلیماتِ علویہ میں ملتا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کا علم وہبی تھا۔ تاہم ذاتِ امیر علیہ السلام کا ارفع و اعلیٰ مرتبہ محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ہم صرف حضرت ابوبکر کا علمی مقام مختصراً پیش کر کے قارئین سے انصاف طلب کرتے ہیں کہ وہ فیصلہ فرمائیں کہ حضرت علی اور حضرت ابوبکر میں بڑا عالم کون ہے۔

علمِ ابوبکر

قبیصہ بن زدیب سے روایت ہے کہ میّت کی نانی حضرت ابوبکر کے پاس میراث مانگنے کا دعویٰ لے کر آئی۔ حضرت ابوبکر نے کہا اللہ کی کتاب میں تیرا کچھ حصّہ نہیں ہے۔ نہ میں نے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے اس معاملہ میں کوئی حدیث سنی ہے۔ تو چلی جا میں لوگوں سے یہ بات دریافت کروں گا۔

چنانچہ حضرت ابوبکر نے لوگوں سے پوچھا مغیرہ بن شعبہ نے کہا میں اس وقت موجود تھا میرے سامنے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نانی کو چھٹا حصہ دلایا ہے۔ ابوبکر نے کہا اور بھی کوئی تمہارے ساتھ ہے جو اس معاملہ کو جانتا ہو تو محمد بن مسلم انصاری کھڑے ہوتے اور جیسا مغیرہ بن شعبہ نے کہا تھا ویسا ہی بیان کیا۔ تب ابوبکر نے چھٹا حصّہ اس کو دلایا۔

پھر حضرت عمر کے وقت میں دادی میراث مانگنے کو آئی۔ حضرت عمر نے کہا اللہ کی کتاب میں تیرا کچھ حصّہ مذکور نہیں ہے۔ اور پہلے جو حکم ہو چکا ہے۔ رسول اللہ صلعم اور حضرت ابوبکر کے زمانے میں وہ نانی کے باب میں ہوا تھا۔ اور میں اپنی طرف سے فرائض میں کچھ بڑھا نہیں سکتا ہوں۔ لیکن وہی چھٹا حصّہ تو بھی ہے اگر نانی بھی ہو تو تم دونوں ۱/۲ کو بانٹ لو۔ اور جو تم دونوں

میں اکیلی ہو یعنی صرف نانی ہو یا صرف دادی وہی چھٹا حصہ لیوے۔
(کشف المغطا عن کتاب الموطا، میراث الجدہ ص۵۰۶ مطبع صدیقی لاہور
ازالۃ الخفا جلد دوم ص۱۳۱ شاہ ولی اللہ، الحجۃ البالغہ ص۱۴۶، صواعق محرقہ ص۲)

اسی طرح علامہ حافظ امام جلال الدین سیوطی اپنی کتاب الاتقان میں لکھتے ہیں :۔

"ابو عبیدہ نے فضائل میں ابراہیم تیمی سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکر سے اللہ تعالیٰ کے فرمان "وفاکھۃ وابا" کے معنی پوچھے گئے تو حضرت ابوبکر نے کہا کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے اور کون سی زمین مجھ کو اٹھائے۔ میں اللہ کی کتاب میں کچھ کہوں جو میں نہیں جانتا ہوں۔ اور یہی عمر بن خطاب سے بھی معاملہ ہوا ہے۔ (اتقان جلد ۱ ص۱۱۵)

ان دونوں واقعات سے حضرات شیخین کا علمی میدان میں عجز اور کم بضاعتی واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی علیہ السلام کی شانِ علمی یہ ہے کہ آپ ہمیشہ یہ دعویٰ فرمایا کرتے تھے کہ جو چاہو پوچھ لو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ۔ علی زمین کی نسبت آسمانوں کے راستوں سے زیادہ واقف ہے۔ علم قرآن و حدیث و فقہ تو رہے۔ ایک طرف آپ نے علوم عامہ کے حقائق پر سے جو پردے اٹھائے وہ آپ کے علم بے مثال ہونے کا روشن ثبوت ہیں۔ چودہ سو سال قبل آپؑ نے چاند و سورج کے زمین سے فاصلے و محیط بیان فرمائے۔ علم نباتات، علم جمادات، علم حیوانات اور منطق و فلسفہ وغیرہ سے متعلق ایسے ایسے کلیات تعلیم دیئے جن کی تائید آج کے سائنس دانوں کے دور میں دانشوروں نے کی ہے اور یہ امور ہم نے حسب استطاعت اپنی کتاب "صرف ایک راستہ" میں پیش خدمت کئے ہیں۔

دینی اعتبار سے معاملہ تعین افضلیت میں یہ بات افضل قرار دینے کے لئے ضروری ہوگی کہ جس ہستی کو جتنی زیادہ معرفت خداوندی اور معرفت رسول

حاصل ہوگی اتنا ہی وہ عارف افضل ہوگا۔ لہٰذا ہم یہ معاملہ بارگاہ رسولؐ میں لے جاتے ہیں اور فیصلہ طلب کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ رسول ہے کہ :-

"اللہ کی معرفت نہیں ہے کسی کو مگر مجھے اور علیؑ کو۔ اور مجھے (رسولؐ کو) نہیں پہچانا کسی نے مگر اللہ نے اور علیؑ نے"

پس یہ فیصل قولِ پیغمبر ثابت کرتا ہے کہ حضرت علیؑ بعد از رسولؐ تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔

علوم قرآنیہ

علوم قرآنیہ میں حضرت علیؑ کے افضل ہونے کی اوّلین دلیل یہ ہے کہ خود صاحبُ القرآن رسولؐ نے آپ کی شان میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ قرآنِ ناطق ہے یعنی بولتا ہوا قرآن ہے۔

ظاہری اعتبار سے حضرت علی علیہ السلام حافظِ قرآن تھے جیسا کہ علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے حضورؐ کے روبرو قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ اور آنحضرت کو سنا دیا تھا۔ جبکہ حضرت ابوبکر کا حافظِ قرآن ہونا ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ پس حضرت امیرؑ کو علوم قرآنیہ میں بھی حضرت ابوبکر پر فضیلت حاصل ہے۔

تقویٰ و اتباعِ شریعت

حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام کے افضلیت تقویٰ و اتباع شریعت کی برھان عظیم یہ ہے کہ انہیں خود سرورِ دو عالمؐ کی بارگاہ سے "امام المتقین" "ولی المتقین" کے القابات حاصل ہوئے۔ پس جس کو رسولؐ ولی و امام قرار دیں تو باقی تمام متقی افراد اس فرمودۂ رسولؐ امام اور ولی کے ماتحت قرار پائیں گے۔ خواہ وہ حضرت ابوبکر ہوں یا کوئی اور۔ چنانچہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا :۔ "پروردگار نے مجھ کو علیؑ کی نسبت وحی بھیجی

ہے کہ وہ تمام متقیوں کا امام ہے۔" (فردوس الاخبار دیلمی)

ظاہر ہے کہ تمام متقیوں میں اگر حضرات شیخین اہل تقویٰ تھے تو نظر خدا و رسولؐ میں ضرور ہوں گے۔ پھر بھی اُن پر وحی کے ذریعہ حضرت علیؑ کو امام قرار دیا گیا ہے۔

امام حاکم، ابونعیم، ابن مردویہ اور ابن قانع وغیرہم نے عبداللہ بن سعد بن زرارہ سے روایت نقل کی ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ شب معراج جب میں اپنے پروردگار کے پاس پہنچا تو مجھے علیؑ کے تین القاب خدا نے القا فرمائے کہ وہ مسلمانوں کا سردار، متقیوں کا امام اور سفید ہاتھ اور منہ والوں کا پیشوا ہے۔ (ارجح المطالب ص۲۰)

اب خود سنی روایات سے حضرت علی علیہ السلام کا امام المتقین ہونا ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ امام کو ماموم پر فضیلت حاصل ہے۔ پس مفتی صاحب کے بیان کردہ اس شرط پر بھی حضرت علیؑ ہی حضرت ابوبکر سے افضل ثابت ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اتباع شریعت اور تقویٰ کے لئے شرک سے مبرّا ہونا بہت ضروری ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت ابوبکر قبل از اسلام چالیس برس ظاہری طور پر مشرک رہے اور بتوں کی پوجا کرتے رہے حتیٰ کہ اُن ایام جاہلیت میں آپ کا نام ہی عبدالکعبہ تھا جبکہ حضرت علیؑ کو اہل سنت کا "کرم اللہ وجہہ" تحریر کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی پیشانی کبھی کسی غیر خدا معبود کے سامنے نہ جھکی۔ نیز یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی حضرت ابوبکر میں شرک چیونٹی کی چال کی طرح مخفی رہا۔ چنانچہ مرقوم ہے کہ:

"جناب رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شرک تمہارے اندر چیونٹی کی چال سے بھی باریک چلتا ہے۔ ابوبکر نے کہا کیا شرک یہ نہیں کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی معبود بنایا جائے۔ حضور نے فرمایا شرک تمہارے اندر چیونٹی کی چال سے بھی باریک چلتا ہے۔"

(تفسیر ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۲۲۹، تفسیر در منثور جلد ۲ صفحہ ۵۰، کنز العمال جلد دوم صفحہ ۹۷
حیوٰۃ الحیوان جلد ۲ صفحہ ۲۲، بروایت حافظ ابو العلیٰ، امام احمد اور بغوی بحوالہ تلک الجلالۃ)
اسی طرح یہی روایت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے یوں نقل کی ہے:۔
"حضرت معقل بن یسار نے کہا میں حضرت ابوبکر کے ہمراہ رسول کریم صلعم کی خدمت میں گیا۔ آپؐ نے فرمایا "اے ابوبکر! شرک تمہارے اندر چیونٹی کی رفتار سے بھی زیادہ باریک چلتا ہے۔" ابوبکر نے کہا کیا شرک وہ نہیں کہ جس نے سوائے اللہ کے کوئی دوسرا معبود بنایا۔ جناب رسولِ خدا نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ شرک چیونٹی کی بھی چال سے باریک چلتا ہے۔ کیا میں تم کو ایسی دعا نہ سکھاؤں کہ جب تم اس کو پڑھو تو شرک تھوڑا ہو یا زیادہ تجھ سے دور ہو جائے۔ فرمایا کہ اللھم انی اعوذ بک ان اشرک بک وانا اعلم واستغفرک لما لا اعلم۔ الخ
اسی مقام پر شاہ ولی اللہ نے دوسری روایت لکھی ہے جس میں یہ الفاظ زائد تحریر ہیں کہ "تیری ماں تجھ پر روئے"۔ یہ کلمہ بد دعائیہ ہے۔
(ازالۃ الخفا مقصد اول صفحہ ۱۹۹)
تمام اہلِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ شرک تقویٰ کو مضر ہے۔ اور اتباعِ شریعت کا مخالف ہے۔ پس اس صورت میں حضرت ابوبکر کا تقویٰ اور اتباعِ شریعت مقام افضلیت پر پورے نہیں اترتے ہیں۔ مزید برآں کہ حضرت ابوبکر کے ایمان کی شہادت دینے پر بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے گریز فرمایا۔ چنانچہ کتب اہل سنتہ میں یہ روایت موجود ہے کہ:۔
"ابو النضر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جنگ احد کے شہداء کے لئے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا میں گواہ ہوں۔ حضرت ابوبکر نے کہا یا رسول اللہؐ کیا ہم ان کے بھائی نہیں ہیں۔ ہم بھی مسلمان ہوئے جیسے وہ مسلمان ہوئے اور ہم نے جہاد کیا جیسے انہوں نے کیا۔ آپؐ نے فرمایا ہاں۔ مگر مجھے

معلوم نہیں کہ تم میرے بعد کیا کرو گے۔ تو حضرت ابوبکر رونے لگے۔ اور کہا کیا ہم زندہ رہیں گے آپ کے بعد"

(کتاب کشف المغطا عن کتاب الموطا مطبع صدیقی لاہور ص۱۰۳ کتاب المغازی واقدی غزوہ احد ص۱۴۲)

اس کے برعکس حضرت علیؑ کے بارے میں حضورؐ نے وثوق سے فرمایا کہ مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ علی میرے بعد دنیا کو اختیار کر کے راہ مستقیم سے ہٹ جائے۔ بلکہ ارشاد فرمایا کہ علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ اے اللہ پھیر دے حق کو ادھر جدھر علی پھر جائے۔

زہد

حضرت امیر علیہ السلام کے زہد کے بارے میں جس قدر اخبار وارد ہوئے ہیں کسی دوسرے کے لئے نہیں۔ چنانچہ مشہور سنی مفسر و امام فخر الدین رازی اپنی کتاب اربعین میں لکھتے ہیں کہ:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت میں ایک گروہ صحابہ کا زہد اور ورع میں مشہور تھا۔ جیسے حضرت ابوذر غفاری، سلمان فارسی ابو درداء وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ سب بزرگوار ترک و تجرید میں مولا علیؑ کے مقلد تھے۔

ابن عساکر اور ابن اثیر نے بیان کیا ہے کہ حسن بن صالح کہتے ہیں کہ لوگ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے زاہدوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا دنیا کے لوگوں میں علی بن ابیطالب سب سے زیادہ زاہد تھے۔

ابوالخیر، امام حاکم، ابن اثیر اور ابن حجر نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علیؑ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ تحقیق تجھ کو اے علی خدا نے ایسی زینت سے مزین کیا ہے کہ کسی کو اس سے بہتر زینت نہیں دی گئی اور وہ زہد فی الدنیا ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کے نزدیک نیک بندوں کی زینت ہے۔ پس

تجھ کو ایسا بنایا ہے کہ تجھے دنیا سے اور دنیا کو تجھ سے کوئی چیز نہ ملی۔ تجھ کو مسکینوں کی محبت دی گئی۔ اور تجھ کو ان کے پیرو ہونے سے راضی کیا ہے۔ اور ان کو تیرے امام ہونے سے خوش کیا ہے۔

امام احمد نے امام ابن شہاب زہری سے نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کہا کرتے تھے کہ ہم اس اُمت میں جناب رسول خداؐ کے بعد علی بن ابی طالب سے زاہد نہیں پاتے کہ انہوں نے نہ کبھی اینٹ پر اینٹ رکھی اور نہ بانس پر بانس دھرا۔

اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ میں امام حسنؑ سے مروی ہے کہ امیرالمومنینؑ نے نہ مال کو جمع کیا اور نہ پیچھے چھوڑا بجز چھ سو درہم کے کہ اس سے خادم خریدنا چاہتے تھے۔

اس کے برعکس ہم حیران ہیں کہ جب حضرت ابوبکر شب ہجرت رسول اکرمؐ کے تعاقب میں گئے تو ان کے پلّے پانچ ہزار درہم تھے۔ جب وفاتِ رسولؐ ہوئی تو انہوں نے دفن رسولؐ پر حصولِ تخت کو فوقیت دی۔ سادات کا خمس غصب کیا۔ باغ فدک ہضم کیا۔ زبردستی لوگوں سے زکواۃ بٹوری اور کئی مسلمانوں کو ناحق قتل کروا دیا۔ اپنے خویش و اقرباء کو مالامال کیا۔ یہ تمام باتیں زُہد کے خلاف ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب روایاتِ سُنیہ ہی سے ثابت ہے کہ خود سرکارِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرما دیا کہ "خدا نے ایسی زینت سے مزین کیا ہے کہ کسی کو اس سے بہتر زینت نہیں دی گئی اور وہ زہد فی الدنیا ہے۔" تو پھر فرمان پیغمبرؐ کے خلاف کسی دوسرے کو زہد میں حضرت علی علیہ السلام سے افضل سمجھنا حکم رسولؐ کی نافرمانی اور امرِ خدا کی سرتابی ہے۔ پس نص جلی کے ساتھ ثابت ہوا کہ زہد میں حضرت علیؑ سے ماسوائے رسول مقبولؐ کوئی شخص بھی بڑھا ہوا نہیں ہے۔

صدقہ و انفاق فی سبیل اللہ

حضرت امیر المومنینؑ کے انفاق فی سبیل اللہ و صدقات کے بارے میں قرآن مجید میں آیتِ ولایت اور سورۂ دہر کا نزول ناقابلِ انکار دلیل علو شانی ہے۔

امام احمد لکھتے ہیں کہ علی فرماتے ہیں کہ اگر تو مجھے آنحضرتؐ کے ساتھ دیکھتا کہ میں نے پتھر اپنے پیٹ پر بھوک کی وجہ سے باندھا ہوا تھا حالانکہ اس دن میری زکواۃ چالیس ہزار تھی اور ایک روایت میں ہے کہ میرے مال کی زکواۃ چالیس ہزار دینار تک پہنچ گئی تھی۔

اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے امام اہل السنۃ محب طبری لکھتے ہیں کہ اکثر وہمی لوگوں کو اس حدیث پر وہم پیدا ہوتا ہے کہ جناب امیرؑ کے پاس اس قدر مال تھا کہ جس کی اتنی بڑی رقم زکواۃ نکلتی تھی حالانکہ یہ بات نہیں ہے کیونکہ آپ سب لوگوں سے زیادہ زاہد تھے چنانچہ پہلے آپ کا حال تحریر ہو چکا ہے۔ ابو الحسن بن فارس لغوی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد بزرگوار سے اس حدیث کا مطلب پوچھا وہ کہنے لگے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ جب سے میرے ہاتھ مال آیا ہے اگر وہ آج کے دن تک میرے ہاتھ میں ہوتا تو اس کی زکواۃ اس قدر بنتی۔ اس کے علاوہ ان اوقاف سے بھی مراد ہو سکتی ہے کہ جن کو جناب امیرؑ نے جاری کیا تھا۔ اور قبل ان کے اجرائ کے وہ ان کے مالک تھے۔ اور شاید کہ ان کا محاصل اس مقدار پر ہو جس کو جناب امیرؑ نے بیان فرمایا ہے۔ (ریاض النضرۃ)

اس امر میں حضرت علی علیہ السلام سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا۔ اور فرشتے تک آپ کے سائل بن کر آتے اور قرآن مجید میں کئی آیات اس سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں۔ جب ہم آیت ولایت کی تفسیر پڑھتے ہیں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ھل اتی کا نزول اس کا ثبوت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علیؑ کے پاس چار درہم تھے کہ ان کے سوا ان کے پاس اور کچھ نہیں تھا۔ آپؑ نے ایک درہم رات کو اور ایک دن کو اور ایک پوشیدہ اور ایک ظاہر خیرات کیا۔ پس پروردگارِ عالم نے یہ آیت نازل فرمائی کہ الذین ینفقون اموالھم باللیل والنھار سرًا وعلانیۃ فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کو خیرات کرتے ہیں رات میں اور دن میں پوشیدہ اور ظاہر پس اُن کے لئے اُن کے رب کے پاس اجر ہے اور نہیں خوف ان پر اور نہ وہ محزون ہوں گے۔

(تفسیر واحدی بحوالہ ارجح المطالب ص۲۱۴)

امیر المومنین کی یہ صفت اس قدر عام و مشہور ہے کہ ان کے دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ صاحب مطالب السئول لکھتے ہیں کہ،

"محقن بن ابی محقن نے معاویہ بن ابوسفیان سے کہا کہ میں بخیل ترین خلائق (یعنی معاذ اللہ علیؑ) سے تیرے پاس آیا ہوں۔ معاویہ نے کہا افسوس ہے تم پر تم اُن (علیؑ) کو کیونکر بخیل کہتا ہے کہ اگر اُن کو ایک سونے کے گھر کا اور ایک اینٹ کے گھر کا مالک بنایا جائے تو قبل اس کے وہ اینٹ کا گھر تمام ہو سونے کا گھر ختم ہو جائے گا۔"

مشہور امام اہل سنت شعبی کہتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام کی سخاوت تمام لوگوں سے بڑھ کر تھی۔ وہ ایسے سخی ترین تھے کہ سخاوت و جود کو محبوب رکھتے تھے کہ کبھی کسی سائل کے لئے اپنی زبان مبارک سے "لا" یعنی "نہیں" ہرگز نہ کہا تھا۔ آپؑ اپنے ہاتھوں سے مدینے کے یہودیوں کے باغات کو سیراب فرماتے تھے یہاں تک کہ اُن کے ہاتھوں میں آبلے پڑ جاتے تھے اور جو اجرت کے پیسے آپؑ کو ملتے تھے وہ خیرات کر دیتے تھے اور اپنے پیٹ پر بھوک کی وجہ سے پتھر باندھ لیتے تھے۔ (مطالب السئول)

علامہ کنوی نے سخاوت امیر المومنینؑ کا ایک محیر العقول واقعہ لکھا ہے جس سے آپ کی فراخدلی، دست کشادگی اور حاجت روائی کا جائزہ جملہ جہات سے لیا جا سکتا ہے۔ علامہ موصوف اپنی طبقات میں نقل کرتے ہیں کہ:

"حضرت علیؑ ایک کافر سے لڑ رہے تھے۔ دونوں طرف لشکر کے لوگ صف باندھے کھڑے تھے۔ مسلمان بہت تھوڑے تھے اور کفار کثرت سے تھے۔ کفار کی جمعیت دس ہزار کے قریب تھی۔ اُس مدمقابل کافر نے حضرت علیؑ سے کہا یا علیؑ اپنی تلوار مجھے دکھائیں۔ جناب امیرؑ نے اپنی تلوار اُس کافر کو دے دی۔ کافر نے تلوار ہاتھ میں لے کر کہا اب جبکہ تم اپنی تلوار مجھے دے چکے ہو۔ اب تم میرے ہاتھوں سے کیسے بچ کر نکل سکتے ہو؟ جناب امیر علیہ السلام نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ تم نے بھکاریوں کی طرح میرے سامنے دستِ سوال دراز کیا۔ پس میری مروّت نے تقاضا کیا کہ سائل کا ہاتھ رد کیا جائے اگرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ امیر المومنینؑ کا یہ جواب اس کافر کی تقدیر بدلنے کے لیے کافی ہوا۔ فوراً ایمان لے آیا۔"

سخیوں کی شان ایسی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے رسول اللہؐ کے ہاتھ اونٹنی کا سودا کر لیا وہ کیا جانیں کہ انفاق فی سبیل اللہ کیا ہوتا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کتب تفاسیر میں جس قدر آیات حضرت علی علیہ السلام کی شان میں دربارہ انفاق فی سبیل اللہ نازل ہوئیں کسی اور بزرگ کے حق میں نازل نہیں ہوئی ہیں۔ یہ نزول آیات ثابت کرتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کے ہم مرتبہ اس صفت میں بھی کوئی دوسرا نہیں ہے۔ افضل ہونا تو بعد کی بات ہے۔

حسنِ سیاست

امیر المومنین علیہ السلام کی سیاست پر ہم نے اپنی کتاب "صرف ایک راستہ" کے باب سیاست، و

قضایا میں مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ رسالہ "دین ہماری سیاست ہے" اسی موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ لہٰذا جن حضرات کو دلچسپی ہو مذکورہ کتب کا مطالعہ فرمالیں۔ جناب امیر علیہ السلام کی سیاست کا بنیادی اصول یہ ہے،

"فن حکمرانی مگر پابندیٔ احکام خدا کے ساتھ"

آپ کی سیرت کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے انہوں نے اپنے گرد پیچیدہ ماحول اور عجیب و غریب رعایا میں اپنا کردار بے داغ چھوڑا ہے۔ انہوں نے سیاست اور دین میں جدائی برداشت نہیں کی ہے۔ اور پُر آشوب دور میں بھی اپنے اصولوں پر سودا (بازی نہیں کی ہے۔ کسی سیاستدان کا اپنے اختیار کردہ موقف پر قائم ودائم رہنا سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے۔ اور آپؑ کے سوانح حیات میں ایک بھی ایسی مثال پیش نہیں کی جاسکتی ہے کہ آپ نے اصولوں سے سر مو بھی تجاوز کیا ہو۔

حضرت امیر المومنینؑ کی سیاسی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ آپؑ نے حکومت قبول کرنے سے پہلے یہ شرط عائد کی تھی کہ میں جس راہ پر مناسب سمجھوں گا چلاؤں گا۔ جبکہ حضرت ابوبکر کے دور میں خود ان کی حیثیت محض ایک کٹھ پتلی حکمران کی سی تھی اور دراصل ریاست کی تمام ذمہ داریاں حضرت عمر کے کاندھوں پر تھیں۔ آپ کو خود اپنے حاکم ہونے پر شک رہتا تھا۔ پہلے ہی خطبہ میں انہوں نے عجز کا اظہار کیا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو میری پیروی کرنا اگر الٹا چلوں تو سیدھا کردینا۔ انہوں نے آخری وقت میں پشیمانی کا اظہار کیا کہ کاش میں خلافت کا بار نہ اٹھاتا۔ کسی نے ان کو خلیفہ کہا تو آپ نے کہا میں خلیفہ نہیں خالف ہوں۔

جب خود حضرت ابوبکر نے اہلیت و قابلیت سیاست سے قاصر ہونے کا اعتراف کرلیا ہے تو پھر کیونکر وہ اس مقابلہ میں شریک ہوسکتے ہیں۔ پس ہماری نظر میں اسلامی سیاست کے لحاظ سے حضرت ابوبکر میں اہلیت ہی کا فقدان ہے

لہٰذا حضرت امیرؑ سے ان کا تقابل بے معنی شے ہے۔ آپ کا ڈھائی سالہ دور فتنوں اور شورشوں سے بھرپور ہے۔ غصب حقوق، بے گناہ قتل عام، مجرموں کی سرپرستی، غیر اسلامی فیصلے، قوانین الٰہیہ میں من مانی ترامیم، ناجائز لشکر کشی اور دھاندلی کے سینکڑوں واقعات کتب میں محفوظ ہیں۔ جن کی تفصیلات کا اخفا ہی حکمت عملی ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی علیہ السلام کی سیاست میں ایک امر بھی ایسا ملنا محال ہے جو سیاست الٰہیہ کے متعارض ہو۔ پس اس لحاظ سے بھی حضرت علی علیہ السلام ہی افضل ہیں۔

مفتی محمد غلام سرور قادری صاحب کی بیان کردہ سات صفات کے تحت ہم نے حضرت امیر المومنینؑ کی افضلیت کے اثبات کتب اہلسنۃ سے نقل کئے۔ اس کے علاوہ کتب اہل سنۃ اور اقوال علمائے اہل سنۃ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جناب سیدنا محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد جناب ابوالحسن، ابوالحسین، ابومحمد، ابوالریحانتین، ابوتراب، ابوالسبطین امیرالمومنین، امام المتقین، ولی المتقین، سید الصادقین، سید المسلمین، سید المومنین، سید العرب، سید فی الدنیا و الآخرۃ، قائد الغر المحجلین، یعسوب المومنین و یعسوب الدین، صدیق الاکبر، فاروق الاعظم، خاتم الوصیین، خیر الوصیین، الوصی، امام البررۃ، قاتل الفجرا، صاحب الرایہ، مقیم الحجۃ، حجۃ اللہ، رایۃ الہدیٰ، ولی اللہ، صفوۃ اللہ، شیخ المہاجرین و الانصار، قسیم النار و الجنۃ، وارث رسول اللہ، خلیفہ رسول اللہ، منار الایمان، امام الاولیا، الہادی، صاحب اللواء، ناصر رسول اللہ، صالح المومنین، مولی المومنین، منجز الوعد، قاتل الناکثین و القاسطین والمارقین، المرتضیٰ، الشاہد، الشہید، الراکع، الساجد، الصفی، الامین، باب حطہ، خلیل ہارون، نفس الرسول، سیف اللہ، ذو الاذن الواعی، قاضی دین رسول اللہ، وزیر رسول اللہ، خیر البشر، ذوالقرنین، خاصف النعل، الطاہر، الصادق، المومن الانزع البطین، العابد، الزاہد، کاسر اصنام الکعبہ، الساقی، الحبیب، القاری،

بیضۃ البلا، المہدی، طنود النبی، ایلیا، قتاب عین الفتنہ، امیر النحل، ذوالبرقہ، مثیل عیسیٰ، القرم، علیم القرآن، عالم التوراۃ وزبور والانجیل، مفسر عظیم، قاری اعلم، محدث اکبر، علیم الفقہ، عالم الفرائض والاحکام باصول الدین، منبع تصوف، موجد نحو، امام الفصاحت والبلاغت، شیخ الشعراء، کاتب الوحی، عالم التعبیر و الرویا، حامل الجفر الجامعہ، عالم الہیئت والریاضی، سید الزاہدین، اسد اللہ الغالب، حیدر کرار، جرار، غیر فرار علی ابن ابی طالب علیہ السلام تمام مخلوقات سے من کل الوجوہ افضل ہیں۔ علما کے اندازے میں تین سو سے زیادہ قرآنی آیات آپ کی شان میں نازل ہوئی ہیں اور میرے نزدیک آپ خود بولتا قرآن ہیں۔ آپ کی ولادت خدا کے گھر میں ہوئی۔ آپ کی تربیت آغوشِ رسالت میں ہوئی۔ آپ نے سب سے پہلے اظہارِ ایمان کیا اور سب سے پہلے نماز پڑھی۔ آپ نے ہرگز کسی غیر خدا بت کی پرستش نہ کی۔ آپ نے مہر نبوت پر سوار ہو کر بت شکنی فرمائی۔ شب ہجرت بستر رسولؐ پر سوئے جو کانٹوں کی سیج اور بستر مرگ تھا (بظاہر) آپ ہی سیدۃ النساء العالمین کے کفو قرار پائے۔ آپ کا گھر حضورؐ کا گھر ہوا۔ آپ کے علاوہ سب کے دروازے مسجد سے بند کر دیئے گئے۔ آپ کو حالت جنب میں مسجد میں آنے کی آزادی ملی۔ اور رسولؐ نے اس داخلہ کو منجانب اللہ قرار دیا۔ آپ کو اخوت رسولؐ کا شرف نصیب ہوا۔ آپ ہی ہارون امت کہلوائے۔ آپ ہی کو رسولؐ نے کہا تم میرے اور میں تمہارا ہوں۔ آپ ہی نظیر رسولِ خداؐ ٹھہرے۔ آپ ہی نظیر مسیح ہوئے۔ آپ ہی کی ذات میں جملہ انبیاء کے جزوی فضائل یکجا بیان ہوئے۔ آپ کا ہاتھ اللہ اور رسولؐ کا ہاتھ بنا۔ آپ ہی کو نفس نورِ واحدہ کا اعزاز ملا۔ آپ ہی کے لئے رسولؐ نے کہا ہم ایک خاک پاک سے ہیں۔ آپ ہی کے نور سے فرشتے پیدا ہوئے۔ آپ ہی کو حضورؐ نے قربانی میں شریک کیا۔ آپ ہی بعد از رسولؐ ہمیشہ رسولؐ کی طرف سے قربانی دیتے رہے۔ آپ ہی کا

قبض روح آپ کی مشیت کے تابع کر دیا گیا۔ آپ ہی کو رسول نے شریک دعا کیا۔ آپ ہی پر سایۂ شفقت رحمۃ اللعالمین سایہ فگن ہوا۔ آپ ہی کو جرائت و اجازت ملی کہ وقت غصہ حضورؐ سے ہمکلامی کر سکیں۔ آپؑ ہی کو رسولؐ نے اپنا سر بنایا اور کہا کہ علی کی منزلت مجھ سے ایسی ہے جیسے سر کو بدن سے۔ آپؑ ہی حضرتؐ سے بمنزلہ حضرتؐ کے خدا سے ہوئے۔ آپؑ کے علاوہ کسی کو حضرتؐ نے اپنے نام اور کنیت کو جمع کرنے کی اجازت نہ دی۔ آپ ہی کے گھر پر فرشتوں کے پرملا کی آوازیں سنائی دیں۔ آپ ہی کو ملائکہ نے سلام پیش کیا۔ اور فرشتوں نے لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار کا قصیدہ پڑھا۔ آپؑ ہی کے ایمان کی ٹھنڈک جبرئیل کے دل کو پہنچی۔ آپؑ ہی راسخ الایمان قرار پائے اور آپ کا ایمان زمین و آسمان سے بھاری فرمایا گیا۔ آپ ہی ذاتِ خداوندی کے لئے سخت و دیوانہ ہوئے۔ آپ ہی کے گوشت و خون سے ایمان کا مخلوط ہوا۔ خدا نے آپ ہی کو امتحانِ ایمان کے لئے منتخب کیا۔ آپ ہی کے دل کو خدا نے براہ راست ہدایت کی۔ آپ ہی بمنزلہ قبلہ و کعبہ ہوئے۔ آپ ہی مثل قل ھو اللہ ہوئے۔ آپ ہی کی ایک ضربت تمام اُمّت کے اعمال سے وزنی نکلی۔ آپ ہی کے دائیں و بائیں جبرئیل و میکائیل ہوئے۔ آپ ہی ہمیشہ ہر جنگ سے کامیاب لوٹے۔ آپ ہی کو دنیا و آخرت میں علمدارِ رسولؐ ہونے کا عہدہ تفویض ہوا۔ آپ ہی کو روزِ خیبر مرد کہا گیا۔ آپ ہی سے تبلیغ سورۂ برأت کا فریضہ پورا ہوا۔ آپؑ ہی نے حضورؐ کی امانتیں ادا فرمائیں اور رسول امین کے امین مقرر ہوئے۔ آپ ہی نے رسولؐ کے قرضے اتارے۔ آپ ہی نے نبیؐ کے وعدوں کو پورا کیا۔ آپ ہی منجانب اللہ رسول خداؐ کی تائید کے لئے مخصوص ہوئے۔ آپ ہی نے مسجد قبا کی بنیاد رکھی۔ آپ ہی کی پیشگوئیاں عہد عتیق میں کی گئیں۔ آپ ہی کو اُمّت کا باپ فرمایا گیا اور جو حق باپ کا اولاد پر ہے وہی حق اُمّت پر آپ کا ہے۔ آپ ہی پر خدا راضی رہا۔ آپؑ ہی کو خدا نے محبوب کہا اور

آپ ہی محبوبِ خدا کے محبوب ہوئے۔ آپ ہی پر خدا نے مباہات کی۔ آپ ہی کی محبت عبادت ہے۔ آپ ہی کی زیارت عبادت ہے جس نے آپ کو چھوڑا اس نے رسولؐ کو چھوڑ دیا۔ جس نے آپ سے دشمنی کی اس نے خدا سے دشمنی کی۔ جس نے آپ کی شان گھٹائی اس نے رسول کی شان گھٹائی۔ جس نے آپ سے حسد کیا اس نے رسولؐ سے حسد کیا۔ جس نے آپ کی اطاعت کی اس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ جس نے آپ کی مدد کی اس نے اللہ کی مدد کی۔ جس نے آپ سے جنگ کی اس نے رسولِ خداؐ سے جنگ کی۔ آپ ہی کا بغض علامت نفاق ہے۔ جس نے آپ کو ایذا دی اس نے حضورؐ کو ایذا دی۔ جس نے آپ پر سبّ کیا اس نے رسولؐ کو گالی بکی۔ جس نے آپ پر غضب کیا اس نے نبی اکرمؐ پر غضب کیا۔ جس نے آپ سے بغض رکھا اس نے رسولؐ سے بغض رکھا۔ آپ سے تولاّ رکھے بغیر جنت کی بو بھی نہیں پائی جا سکتی۔ آپ ہی کی محبت علامت اسلام مقرر ہوئی۔ آپ ہی کے تولاّ کو پل صراط پار کرنے کی شرط قرار دیا گیا۔ آپ ہی کا گوشت لحمِ رسولؐ ہے۔ آپ ہی کا خون دمِ رسولؐ ہے۔ آپ ہی رازدارِ رسولؐ ہوئے۔ آپ ہی کو وقتِ آخر حضورؐ نے اپنی ردائے مبارک میں لیا۔ آپ ہی نے آنحضرتؐ کو غسل دیا۔ روزِ قیامت آپ ہی پر شفیع المذنبین تکیہ فرمائیں گے۔ آپ ہی قرآن کے ساتھی بنائے گئے۔ آپ ہی سے حق کا الحاق کر دیا گیا۔ آپ ہی کی شہادت پر قدرتی آثار ظاہر ہوتے۔ آپ ہی جنت میں رسولؐ کے ہم مقام ہوئے۔ آپ ہی روزِ قیامت سب سے پہلے اپنا دعویٰ پیش کریں گے۔ آپ ہی قسیم نار اور قسیم جنۃ بنائے گئے۔ آپ ہی ساقیٔ کوثر ہوئے۔ آپ ہی کل ایمان ہوئے۔ آپ کی شہادت بحالتِ روزہ مسجد میں ہوئی۔ آپ ہی کے قاتل کو اشقی الآخرین کہا گیا۔ آپ ہی کو سید شباب اہل الجنۃ سے افضل قرار دیا گیا۔

الغرض مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی شان میں جس

قدر احادیث وارد ہوئی ہیں ان کو دیکھ کر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ جناب امیرؑ کی نسبت کسی شخص نے غیر اکتساب فضائل نہیں کیا۔ اور حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب لاتحصٰے ہیں۔

مسئلہ تفضیل پر اس عبوری گفتگو کے بعد اب ہم واقعہ ہجرت پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ شب ہجرت حضرت ابوبکر کی رفاقت رسولؐ فضیلت کے کس معیار پر ہے۔ حضرات اہل سنۃ والجماعۃ عموماً اس واقعہ کو حضرت ابوبکر کے فضائل میں بڑے طمطراق سے بیان کرتے ہیں۔ اور بڑے افسانوی انداز میں اس قصہ کی تشہیر کی جاتی ہے۔ بلاشبہ تاریخ اسلام کا انتہائی اہم اور ناقابلِ فراموش یہ واقعہ اس بات کا ضرور مستحق ہے کہ اس کے پس منظر، وقوعات اور نتائج پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ لہٰذا ہم چاہتے ہیں چونکہ یہ تاریخی واقعہ ہے لہٰذا اس پر تبصرہ اندازی کرتے ہوئے مورخانہ ذہنیت کو بروئے کار لاتے ہوئے مناظرہ سے جدائی اختیار کریں اور سب سے پہلے صرف واقعہ کو نقل کریں۔ اس کے بعد اس کی جزئیات زیر بحث لائیں اور تمام امور متنازعہ کو فرداً فرداً حل کرنے کی کوشش کریں کیونکہ سنی مورخین نے اس واقعہ کو کتب تاریخ کی بجائے کتب احادیث سے اخذ کیا اس لئے ہم بھی نقلاً اس طریقہ پر ہی عمل کرتے ہیں:-

واقعہ ہجرت مدینہ اور بخاری شریف

علمائے اہل سنۃ نے اپنی کتب تاریخ میں زیادہ تر یہ واقعہ اپنی سب سے بڑی کتاب صحیح بخاری سے اخذ کر کے نقل کیا ہے۔ چنانچہ ہم بھی بخاری شریف ہی سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں۔

"یحییٰ ابن بکیر، لیث، عقیل، ابن شہاب، عروہ بن زبیر، رسول اللہؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے والدین کو دین (اسلام) سے مزین پایا۔ اور کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح و شام دونوں وقت ہمارے یہاں تشریف نہ لاتے ہوں۔ جب مسلمانوں کو ستایا جانے لگا تو حضرت ابوبکرؓ بارادہ ہجرت حبش (گھر سے) نکلے۔ حتیٰ کہ جب (مقام) برک الغماد تک پہنچے تو ابن الدغنہ سے جو (قبیلہ) قارۃ کا سردار تھا ملاقات ہو گئی۔ اس نے پوچھا اے ابوبکرؓ کہاں جا رہے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے میری قوم نے نکال دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سیاحی کروں۔ اور اپنے رب کی عبادت کروں۔ ابن الدغنہ نے کہا کہ اے ابوبکرؓ تم جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے اور نہ نکالا جا سکتا ہے۔ تم فقیر کی مدد کرتے ہو۔ رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتے ہو۔ بے کسوں کی کفالت کرتے ہو۔ مہمان کی ضیافت کرتے ہو اور حق کی (راہ میں پیش آنے والے) مصائب میں مدد کرتے ہو۔ میں تمہارا حامی ہوں۔ چلو لوٹ چلو۔ اور اپنے وطن ہی میں اپنے رب کی عبادت کرو۔ چنانچہ آپ ابن الدغنہ کے ساتھ واپس آئے۔ پھر ابن الدغنہ نے شام کے وقت تمام اشراف قریش میں چکر لگایا اور اُن سے کہا کہ ابوبکرؓ جیسا آدمی نہ تو نکل سکتا ہے اور نہ نکالا جا سکتا ہے۔ کیا تم ایسے شخص کو نکالتے ہو جو فقیر کی مدد کرتا ہے رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ اور حق کی (راہ میں پیش آنے والے) مصائب میں مدد کرتا ہے۔ پس قریش نے ابن الدغنہ کی امان سے انکار نہ کیا۔ اور ابن الدغنہ سے کہا کہ ابوبکرؓ سے کہدو کہ اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کریں۔ گھر میں نماز پڑھیں اور جو جی چاہے پڑھیں اور ہمیں اس سے تکلیف نہ دیں۔ اور زور سے نہ پڑھیں کیونکہ ہمیں خوف ہے کہ ہماری عورتیں اور بچے (اس نئے دین میں) پھنس جائیں گے۔ ابن الدغنہ نے

حضرت ابوبکرؓ سے یہ بات کہہ دی۔ کچھ عرصہ تک حضرت ابوبکرؓ اسی طرح اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کرتے رہے کہ نہ زور سے نماز پڑھتے تھے اور نہ گھر کے سوا پڑھتے تھے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کے دل میں آیا تو انہوں نے ایک مسجد اپنے گھر کے سامنے بنالی اور اب وہ اس مسجد میں نماز اور قرآن پڑھتے۔ مشرکین کی عورتیں اور بیٹے ان کے پاس جمع ہو جاتے اور ان سے خوش ہوتے اور ان کی طرف دیکھتے تھے۔ بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ (رقت قلبی کی وجہ سے) بڑے رونے والے تھے۔ جب وہ قرآن پڑھا کرتے تو انہیں اپنی آنکھوں پر اختیار نہ رہتا۔ اشراف قریش اس بات سے گھبرا گئے اور انہوں نے ابن الدغنہ کو بلا بھیجا۔ جب وہ ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے تمہاری امان کی وجہ سے ابوبکرؓ کو اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے رب کی عبادت کریں۔ مگر وہ اس حد سے بڑھ گئے۔ اور انہوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنا ڈالی اور اس میں زور سے نماز و قرآن پڑھتے ہیں اور ہمیں خوف ہے کہ ہماری عورتیں اور بچے نہ پھنس جائیں۔ لہٰذا انہیں روکو۔ اگر وہ اپنے رب کی عبادت اپنے گھر میں کرنے پر اکتفا کریں تو بہتر اور اگر وہ اعلان کئے بغیر نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ وہ تمہاری ذمہ داری کو واپس کر دیں۔ کیونکہ ہمیں تمہاری بات نیچا کرنا بھی گوارہ نہیں۔ اور ہم ابوبکرؓ کو اس اعلان پر چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ابن الدغنہ ابوبکرؓ کے پاس آیا اور کہا جس بات پر میں نے آپ سے معاہدہ کیا تھا آپ کو معلوم ہے۔ اب یا تو اسی پر قائم رہو یا میری ذمہ داری مجھے سونپ دو۔ کیونکہ یہ مجھے گوارہ نہیں ہے کہ اہل عرب یہ بات سنیں کہ میں نے جس شخص سے معاہدہ کیا تھا اس کی بابت میری بات نیچی ہو۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں تمہاری امان تمہیں واپس کرتا ہوں اور اللہ عزوجل کی امان پر راضی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانہ میں مکہ میں تھے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ مجھے (خواب

میں) تمہاری ہجرت کا مقام دکھایا گیا ہے کہ وہاں کھجور کے درخت ہیں۔ اور وہ دو سنگستانوں کے درمیان واقع ہے۔ پھر جس نے بھی ہجرت کی تو مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اور جو لوگ حبشہ کی طرف گئے تھے ان میں سے اکثر مدینہ لوٹ آئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی تیاری کی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم کچھ ٹھہرو۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔ حضرت ابوبکرؓ نے (فرط مسرت سے) عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا آپ کو ایسی امید ہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کی وجہ سے رک گئے۔ اور دو اونٹنیاں جو اُن کے پاس تھیں انہیں چار مہینوں تک کیکر کے پتے کھلاتے رہے۔ ابن شہاب بواسطہ عروہ حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتی ہیں کہ ہم ابوبکرؓ کے مکان میں ٹھیک دوپہر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کہنے والے نے ابوبکرؓ سے کہا (دیکھو) وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہ پر چادر ڈالے ہوئے (تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کی یہ تشریف آوری) ایسے وقت تھی جس میں آپ کبھی ہمارے ہاں تشریف نہ لاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان بخدا ضرور کوئی بات ہے جبھی تو آپ اس وقت تشریف لائے۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ آپ کو اجازت مل گئی۔ آپ اندر تشریف لائے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ سے فرمایا اپنے پاس سے اوروں کو ہٹا دو۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہو جائیں۔ یہاں تو صرف آپ کی گھر والی ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے ہجرت کی اجازت مل گئی ہے۔ ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں مجھے بھی رفاقت کا شرف عطا ہو!؟ آپ نے

فرمایا۔ ہاں (رفیق سفر تم ہو گے) حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان میری ایک اونٹنی لے لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم تو بقیمت لیں گے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پھر ہم نے ان دونوں کے لئے جلدی میں جو کچھ تیار ہو سکا کر دیا۔ اور ہم نے ان کے لئے چمڑے کی ایک تھیلی میں تھوڑا سا کھانا رکھ دیا۔ اسماء بنت ابوبکرؓ نے اپنے ازار بند کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس تھیلی کا منہ اس سے باندھ دیا۔ اسی وجہ سے ان کا لقب (ذات النطاق) ازار بند والی ہو گیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ جبل ثور کے ایک غار میں پہنچ گئے۔ اور اس میں تین دن تک چھپے رہے۔ عبداللہ بن ابوبکر جو نوجوان ہشیار اور ذکی لڑکے تھے آپ حضرات کے پاس رات گذارتے اور علی الصبح اندھیرے منہ ان کے پاس سے جا کر مکہ میں قریش کے ساتھ اس طرح صبح کرتے جیسے انہوں نے یہیں رات گذاری ہے اور قریش کی ہر وہ بات جس میں ان دونوں حضرات کے متعلق کوئی مکر و تدبیر ہوتی یہ اسے یاد کر کے جب اندھیرا ہو جاتا تو ان دونوں حضرات کو آکر بتا دیتے تھے۔ اور ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ ان کے پاس ہی دن کے وقت بکریاں چراتے اور تھوڑی رات گئے وہ ان دونوں کے پاس بکریاں لے جاتے اور یہ دونوں حضرات ان بکریوں کا دودھ ہی پی کر اطمینان سے رات گذارتے حتیٰ کہ عامر بن فہیرہ صبح منہ اندھیرے ان بکریوں کو ہانک لے جاتے اور ان تین راتوں میں ایسا ہی کرتے رہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ نے (قبیلہ) بنی دیل کے ایک آدمی کو بنی عبد بن عدی میں سے تھا مزدور رکھا۔ وہ بڑا واقف کار رہبر تھا۔ اور آل عاص بن وائل سہمی کا حلیف تھا۔ اور کفار قریش کے دین پہ تھا۔ ان دونوں نے اسے امین بنا کر اپنی دونوں سواریاں اس کے حوالہ کر دیں۔ اور تین راتوں کے بعد صبح

کو ان دونوں سواریوں کو غارِ ثور پر لانے کا وعدہ لے لیا۔ (چنانچہ وہ حسب وعدہ آ گیا۔) اور ان دونوں حضرات کے ساتھ عامر بن فہیرہ اور وہ رہبر اُن کو ساحل کے راستہ پر ڈال کر لے چلا۔ ابن شہاب نے فرمایا سراقہ بن جعشم کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن مالک مدلجی نے بواسطہ اپنے والد کے سراقہ بن جعشم سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس کفار قریش کے قاصد آ پڑے (جو اعلان کر رہے تھے) کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کو قتل کر دے یا پکڑ لائے تو اُسے ہر ایک کے عوض سو اونٹ ملیں گے۔ اسی حال میں اپنی قوم بنی مدلج کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان میں سے ایک آدمی آ کر ہمارے پاس کھڑا ہو گیا۔ ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے کہا اے سراقہ! میں نے ابھی چند لوگوں کو ساحل پر دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے ساتھی ہیں سراقہ کہتے ہیں کہ میں سمجھ تو گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں (مگر) میں نے (اسے دھوکہ دینے کے لئے تاکہ وہ میرے حاصل کردہ انعام میں شریک نہ ہو سکے) اس سے کہا یہ وہ لوگ نہیں ہیں۔ بلکہ تو نے فلاں فلاں آدمی کو دیکھا ہے۔ جو ابھی ہمارے سامنے سے گئے ہیں۔ پھر میں تھوڑی دیر مجلس میں ٹھہر کر کھڑا ہو گیا اور گھر آ کر اپنی باندی کو حکم دیا کہ وہ میرے گھوڑے کو لے جا کر (فلاں) ٹیلہ کے پیچھے میرے لئے پکڑ کر کھڑی رہے۔ اور میں اپنا نیزہ لے کر اس کی نشام سے زمین پر خط کھینچتا ہوا اور اوپر کے حصّہ کو جھکائے ہوئے گھر کے پیچھے سے نکل آیا۔ حتیٰ کہ میں اپنے گھوڑے کے پاس آ گیا۔ پس میں نے اپنے گھوڑے کو اڑا دیا۔ کہ وہاں جلد پہنچ سکوں۔ جب میں ان حضرات کے قریب ہوا تو گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور میں گر پڑا۔ فوراً میں نے کھڑے ہو کر اپنے ترکش میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے تیر نکالے۔ پھر میں نے ان تیروں سے یہ فال نکالی کہ آیا میں انہیں نقصان پہنچا سکوں گا یا نہیں؟ تو وہ بات نکلی

جو مجھے پسند نہیں تھی۔ پھر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور میں نے ان تیروں کی فال کی پرواہ نہ کی۔ وہ گھوڑا مجھے ان کے قریب لے گیا۔ حتیٰ کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت (کی آواز) سُنی۔ آپ ادھر ادھر نہیں دیکھ رہے تھے۔ اور ابو بکرؓ ادھر ادھر بہت دیکھ رہے تھے کہ میرے گھوڑے کے اگلے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور میں اس کے اوپر سے گر پڑا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو للکارا۔ جب وہ (بڑی مشکل سے) سیدھا کھڑا ہوا۔ تو اس کے اگلے پاؤں کی وجہ سے ایک غبار اٹھ کر دھوئیں کی طرح آسمان تک چڑھنے لگا۔ پھر میں نے تیروں سے فال نکالی تو اس میں میری ناپسندیدہ بات نکلی۔ پھر میں نے ان حضرات کو امان طلب کرتے ہوئے پکارا۔ تو یہ ٹھہر گئے۔ میں سوار ہو کر ان کے پاس آیا۔ تو ان تک پہنچنے میں مجھے جو مواقع پیش آئے ان کے پیش نظر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین غالب ہو جائے گا۔ تو میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے آپ کی گرفتاری یا قتل کے سلسلہ میں سو اونٹ انعام کے مقرر کئے ہیں۔ اور میں نے انہیں وہ تمام خبریں بتا دیں جو لوگوں کا ان کے ساتھ ارادہ تھا۔ اور میں نے ان کے سامنے کھانا اور سامان پیش کیا لیکن انہوں نے کچھ نہ لیا۔ اور نہ مجھ سے کچھ مانگا۔ صرف یہ کہا ہمارا حال چھپانا۔ پھر میں نے آپ سے درخواست کی کہ مجھے ایک امن کی تحریر لکھ دیں۔ آپ نے عامر بن فہیرہ کو حکم دیا۔ انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر تحریر لکھ دی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے گئے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ سے عروہ بن زبیر نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات زبیر سے ہوئی جو مسلمان تاجروں کے ایک قافلہ میں شام سے آرہے تھے۔ تو زبیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پہننے کے لئے سفید کپڑے دیئے۔ ادھر مدینہ کے مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے نکل آنے کی خبر سُن لی

تھی۔ تو وہ روزانہ صبح کو (مقام) حرہ تک (آپ کے استقبال کے لیے) آتے اور آپ کا انتظار کرتے رہتے یہاں تک کہ دوپہر کی گرمی کی وجہ سے واپس چلے جاتے۔ ایک دن وہ طویل انتظار کے بعد واپس چلے گئے اور جب اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے۔ تو اتفاق سے ایک یہودی اپنی کسی چیز کو دیکھنے کے لیے مدینہ کے کسی ٹیلہ پر چڑھا۔ پس اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو سفید (کپڑوں میں ملبوس) دیکھا۔ کہ سراب ان سے چھپ گیا ہے۔ تو وہ یہودی بے اختیار بلند آواز سے پکارا کہ اے گروہ عرب! یہ ہے تمہارا نصیب و مقصود جس کا تم انتظار کرتے تھے۔ یہ سنتے ہی مسلمان اپنے اپنے ہتھیار لے کر امنڈ آئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام حرہ کے پیچھے استقبال کیا۔ آپ نے ان سب کے ساتھ داہنی طرف کا راستہ اختیار کیا۔ حتیٰ کہ آپ نے ماہ ربیع الاول پیر کے دن بنی عمرو بن عوف میں قیام فرمایا۔ پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش بیٹھے رہے۔ جن انصاریوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا تو وہ آتے تو حضرت ابوبکرؓ کو سلام کرتے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ آ گئی۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر اپنی چادر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کر دیا۔ اس وقت ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی عمرو بن عوف میں دس دن سے کچھ اوپر مقیم رہے۔ اور یہیں اس مسجد کی بنیاد ڈالی جس کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ پھر آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر چلے۔ لوگ آپ کے ساتھ چل رہے تھے یہاں تک کہ وہ اونٹنی مدینہ میں (جہاں اب مسجد نبوی ہے (اس) کے پاس بیٹھ گئی۔ اور وہاں اس وقت کچھ مسلمان نماز پڑھتے تھے اور وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی جو اسعد بن زرارہ کی تربیت میں تھے۔ جن کا نام سہل و سہیل تھا۔ ان کی کھجوروں

کا کھلیان تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی بیٹھ گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انشاء اللہ یہی ہمارا مقام ہوگا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بچوں کو بلایا اور اس جگہ مسجد بنانے کے لئے آپ نے اس کھلیان کی ان سے قیمت معلوم کی تو انہوں نے کہا (ہم قیمت) نہیں (لیں گے) بلکہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم یہ زمین آپ کو ہبہ کرتے ہیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ مسجد کی بنیاد ڈالی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحابہ کرام کے ساتھ اس کی تعمیر میں اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ اور فرماتے جاتے تھے یہ بوجھ اٹھانا اے ہمارے رب بڑا نیک اور پاکیزہ کام ہے۔ اور آپ فرما رہے تھے اے خدا ثواب صرف آخرت کا ہے۔ انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔ پھر آپ نے کسی مسلمان شاعر کا شعر پڑھا جس کا نام مجھے نہیں بتایا گیا۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ احادیث میں ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شعر کے سوا کسی اور شعر کو پورا پڑھا ہو۔"

(صحیح بخاری۔ جلد دوم۔ کتاب الانبیاء۔ حدیث نمبر ۱۰۸۷، صفحہ ۱۷۱ تا صفحہ ۱۷۲ مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز۔ قرآن محل۔ کراچی)

صحیح بخاری کی یہ منقولہ روایت امام بخاری کی قلم کاری کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ ورنہ محقق امر یہ ہے کہ محدثین و مورخین اہل سنت کے طبا عیوں کا مکمل دفتر جن کے مواد و اجزا کی ترتیب و تدوین تو حکومت ثلاثہ ہی کے دور میں شروع ہو گئی تھی مگر عہد بنی امیہ میں فرامین شاہی کے ذریعے ان موضوعات کے طومار کو بزور طاقت و لالچ اصل عقائد میں سمو دیا گیا۔ اور آئندہ سلاطین نے اس تدبیر کو استحکام حکومت کا لازمی ذریعہ قرار دیا۔ ان موضوعات کی تشہیر کو اس مستحکم انداز میں جاری رکھا کہ یہ مصنوعات حقیقی روایات پر سبقت لے گئیں۔ لیکن باوجود اس اہتمام و انتظام کے حقیقت کو مٹایا نہ

جا سکا۔ چونکہ ہمیں ان مرویات پر تنقید کی عادت ہو چکی ہے لہٰذا انکشافِ حقیقت کے لیئے بخاری شریف سے پوری روایت کو نقل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

صحیح بخاری کے مطالعہ یافتہ قارئین پر یہ بات ضرور واضح ہو گی کہ امام بخاری صاحب اختصار پسند محدث ہیں۔ لیکن یہ روایت خلافِ عادت انہوں نے خوب پھیلا کر رقم فرمائی ہے۔ اور مختصر نویسی پر طویل ارقمی کو پسند فرمانا ایک اتفاقیہ بات نہیں ہے بلکہ وہی ضرورتِ خاص ہے جس کا تذکرہ ہم نے اوپر کیا ہے۔ اور اس بات کو خود علماء اہل سنتہ نے بھی تاڑ لیا ہے چنانچہ مولوی شبلی نعمانی جیسے شمس العلمائے بزرگ محقق نے اسے خصوصاً محسوس کیا ہے۔ شبلی کے نزدیک کم عمری اور عدم صلاحیت مانع روایت تھی کیونکہ انہوں نے واقعۂ قرطاس کا انکار محض عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی کم سنی کے باعث کیا ہے حالانکہ وہ پندرہ برس کے نوجوان تھے۔ لہٰذا اس روایت کی راویہ بی بی عائشہ کی صرف چھ سال عمر ان کو روایت کرنے سے نااہل قرار نہ دے سکی۔ بلکہ اپنی ساکھ اور بات رکھنے کے لیئے خیال کر لیا کہ انہوں نے یہ واقعہ رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکر سے سنا ہوگا یعنی احتمال ہے یقین نہیں۔ پھر بہرحال یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ معاملۂ فدک میں اولاد کی شہادت والدین کے حق میں قبول نہ کی گئی مگر یہاں وہ کلیہ کیوں نظر انداز کر دیا گیا؟ اصولِ تنقید کے مطابق اور مختار اسلاف اہل سنتہ کے تحت تو حضرت عائشہ کی وہ تمام روایات ناقابلِ اعتبار ٹھہرتی ہیں، جو انہوں نے اپنے والد صاحب کے حق میں روایت کی ہیں۔ مگر یہ کلیے تو محض مصلحۃً وضع کئے گئے ہیں تاکہ اخفائے فضائل آلِ محمدؐ ہو سکے۔ اپنے ہاں کسی بھی معاملے میں اس لحاظ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اکثریت بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ اور اجماع بھی کوئی معمولی شے نہیں جسے آسانی سے قطع نظر کیا جا سکے۔

ہم نے تو صحیح بخاری ہی پر اکتفا کیا ہے اگر لغویاتِ طبرانی، دیلمی،

سہیلی اور سمہودی کے طومار کا انبار دیکھا جائے تو الف لیلیٰ کی ایک نئی کہانی بن سکتی ہے۔ المختصر ایک طالب علم جب ہجرت کی حقیقت و ضرورت پر غور کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ "وقت وقوع ہجرت حالات ایسے تھے کہ کفار قریش کی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ انہوں نے قتل رسولؐ کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اور خدا کو اپنے رسولؐ کی رازدارانہ حفاظت منظور تھی۔" ان علل و اسباب پر جب نظر غائر ڈالی جائے تو بخاری صاحب کی ہر روایت بالکل خلافِ مصلحت دکھائی دیتی ہیں۔

اولاً جب ہم یہ روایت پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ ہجرت کا بیان نہیں بلکہ حضرت ابوبکر کی صدیقیت، صحابیت، حمایت، رفاقت، خدمات اور رسولؐ پر اُن کے احسانات کے رنگا رنگ مرقعوں کا خوبصورت و دلکش البم تیار کیا گیا ہے۔ جب اس طلسمی مرقع میں نبی اکرمؐ کے پیکرِ نورانی کی زیارت کی جاتی ہے تو اس پر حضرت ابوبکر کے احسانات کی زیر باری اور اُن کی مشورت و ہدایت کی متابعت کا رنگ ایک طرف افشائے راز خداوندی اور مصلحتِ وقتی سے خلاف ورزی کا نمونہ دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف فضائل و مناقب ابوبکر کی مضمون آفرینی نے نفسِ مضمون کو اتنا دبا دیا ہے کہ تاریخِ اسلام کے اس عظیم الشان واقعہ کی اپنی حقیقت ہی باقی نہیں رہتی ہے۔

اس روایت کے بیان کے مطابق ہجرت عین دوپہر کے وقت ہوئی جیسا کہ عائشہ فرماتی ہیں کہ "ہم ابوبکر کے مکان میں ٹھیک دوپہر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کہنے والے نے ابوبکر سے کہا ۔۔۔۔۔۔ الخ" حالانکہ یہ بات صریحاً خلافِ واقعہ ہے کیونکہ ہجرت رات کے وقت ہوئی۔ اور آنحضرتؐ رات ہی کو حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر لٹا کر گھر سے باہر تشریف لائے۔

واقعہ شب ہجرت درحقیقت ایک سرِ عظیم تھا۔ اس سے قبل عقبہ کی دونوں بیعتیں بڑی رازداری سے منعقد ہو چکی تھیں۔ اور ہجرت ان کے دو ماہ بعد ہوئی۔

جس رسولؐ نے انصارِ مدینہ کی حمایت و بیعت کو صیغۂ راز میں رکھا اس سے یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ ہجرت جیسے رازِ الٰہی کو افشا کر دیتا۔ جبکہ کفار کی مخالفت شدید ترین تھی۔

ابنِ حجر عسقلانی کی رائے

اس روایت کے مطابق آنحضرت دوپہر کے وقت حضرت ابوبکر کے گھر تشریف لائے اور اُن کو آگاہ کیا کہ مجھے ہجرت کا حکم ہوگیا ہے۔ چنانچہ ابوبکر کو ساتھی بنانا منظور کیا اور اُسی وقت تیاری کر کے روانہ ہوتے۔ یہ بیان اس قدر خلافِ واقعہ ہے کہ خود علماء اہل سنت مجبور ہوگئے ہیں کہ اس کی تردید کریں۔ چنانچہ شارع صحیح بخاری مشہور علامہ اہل السنۃ ابن حجر عسقلانی نے اعتراف کیا ہے کہ یہ واقعہ قطعاً ساقط الاعتبار ہے۔ امام ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ابن عباسؓ کی دوسری روایت زیادہ مناسب واقعہ ہے۔ اس مقام سے جس کو حضرت امام احمد بن حنبل اور امام حاکم نے عمر بن میمون سے روایت کی ہے کہ بعد تشریف بری جناب رسول خدا صلعم مشرکین حضرت علیؑ پر پتھر برسا رہے تھے یہ سمجھ کر کہ رسول اللہ صلعم لیٹے ہوتے ہیں کہ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ آئے اور حضرت علیؑ کو آنحضرت سمجھ کر کہا یا رسول اللہ تو حضرت علیؑ نے فرمایا رسولِ خدا صلعم تو بیر میمون کی طرف تشریف لے گئے تم بھی جا کر مل جاؤ۔ ابوبکر اُدھر روانہ ہوئے۔ اور حضرت کے ساتھ داخلِ غار ہوئے۔ الحدیث۔ اور اصل اس کی ترمذی اور نسائی میں ہے۔"

(فتح الباری شرح صحیح البخاری)

اب خود شارح بخاری کے اعتراف سے معلوم ہوگیا کہ نہ ہی حضرت رسولِ کریمؐ نے حضرت ابوبکر کو کسی قسم کی کوئی اطلاع دی اور نہ ہی ان سے کوئی صلاح و مشورت کی تھی۔ کیونکہ دفعتہً حکم ہجرت نازل ہونے کے بعد آپؐ کو ان امور کی فرصت ہی نہ تھی۔ جیسا کہ آئندہ ہم تحریر کریں گے۔ کہ

ہجرت کا حکم ملتے ہی حضورؐ غار کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت ابوبکر آنحضرتؐ کے تشریف لے جانے کے بعد حسبِ معمول آئے اور جناب امیرؑ کو بستر رسولؐ پر سبز چادر اوڑھے پایا۔ لہٰذا رسولؐ سمجھ کر "یا رسول اللہؐ" پکارا۔ جناب امیرؑ نے غلط فہمی کو دور کیا۔ اور بتایا کہ بیر میمون کی طرف گئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اس نقل و حرکتِ رسولؐ سے قطعاً بے اطلاع و بے خبر تھے۔ لہٰذا وہ تمام قصص جن میں آنحضرتؐ کا حضرت ابوبکر کے گھر جا کر مشورہ کرنا وارد ہوا ہے صریح کذب ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ابن حجر نے یہ روایت بطریق منفرد لکھی ہے جیسا کہ کچھ سنی علماء نے اعتراض کیا ہے تو جواب یہ ہے کہ ابن حجر نے اس روایت کو امام احمد بن حنبل اور امام حاکم کے اسناد سے لکھا ہے۔ دونوں اماموں نے اس واقعہ کو مختصراً درج کیا ہے اور اصل اس کی صحاح ستہ میں سے دو صحیح کتب ہیں یعنی صحیح ترمذی اور نسائی۔ اس لحاظ سے یہ حدیث پانچ جلیل القدر محدثین کی مصدقہ ثابت ہے اور اس کی چھٹی اسناد حسب ذیل عبارت میں ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ سیوطی کا بیان

ابن مردویہ اور ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہؐ شب کو مکان سے باہر نکلے اور قریب غار پہنچے تو آپ کے پیچھے ابوبکر بھی آ رہے تھے۔ حضرتؐ نے جب ان کی آہٹ سنی تو خوف ہوا کہ کوئی پکڑنے والا نہ ہو۔ ابوبکر نے کھکارا تو آنحضرتؐ نے آواز سے پہچانا اور کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ دونوں وہاں سے ساتھ ہو گئے۔ اور پھر اسی طرح غار تک پہنچے۔" (درمنثور ج ۳ ص ۲۴۰ سیوطی)

علامہ حافظ جلال الدین سیوطی نے بیان کردہ اس روایت بخاری کی قلعی کھول دی اور بتلا دیا کہ حضرت ابوبکر کی شرکت یا رفاقت حضورؐ کی اجازت و مرضی کے خلاف تھی۔ ورنہ آہٹ سن کر تعاقب کرنے والے کا گمان

پیدا نہ ہوتا۔ ایسی لاعلمی کہ ضرورتِ معلومہ کے لئے وقت موعودہ پر حضرت ابوبکر کو آتے ہوئے دیکھ کر بھی آنحضرت صلعم نہ پہچان سکے، ثابت کرتی ہے کہ ہجرت کے متعلق حضرت ابوبکر سے کسی قسم کا کوئی مشورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ لیا۔ بلکہ امر ملتے ہی فوری طور پر روانہ ہو گئے۔ علامہ سیوطی اس سلسلے میں ایک اور روایت نقل کرتے ہیں کہ:

حضرت عمر کی گواہی

بیہقی نے الدلائل اور ابن عساکر نے حلیہ میں محض العبری سے روایت کی ہے کہ ہم نے حضرت عمر بن الخطاب سے کہا کیا آپؓ ابوبکرؓ سے بہتر ہیں؟ تو حضرت عمرؓ رونے لگے۔ اور کہنے لگے قسم خدا کی ابوبکرؓ کی ایک رات اور ایک دن بہتر ہے عمرؓ سے۔ رات تو وہ کہ جس شب کو حضرت مکہ سے روانہ ہوئے ہیں تو ابوبکر نے تعاقب کیا اور کبھی آگے ہو جاتے تھے اور کبھی آپ کے پیچھے چلنے لگتے تھے کبھی داہنی طرف چلتے اور کبھی بائیں طرف ہو جاتے تھے۔"
(تفسیر در منثور جلد ۳ صفحہ ۲۴۱)

اب تو حضرت عمر بن خطاب نے بخاری والی مشورت اور انتظام و بند و بست سفر وغیرہ کی تمام پیش بندیوں پر خاک ڈال کر حضرت ابوبکر کا تعاقب کرنا تسلیم کیا ہے۔ احادیث و تفاسیر کے بعد اب تاریخی ثبوت پیش خدمت ہے۔ اور اس تاریخ سے کہ جو اُم التواریخ ہے۔

تاریخ طبری

حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؑ کے پاس آئے اور حضرت رسول خدا صلعم کا حال دریافت کیا۔ حضرت علیؑ نے کہا حضرت غارِ ثور کی طرف تشریف لے گئے۔ اگر تم کو کچھ مطلب ہو تو جا کر آپؐ سے مل جاؤ۔ حضرت ابوبکرؓ نہایت سرعت سے ادھر چلے۔ حضرتؐ کو اُن کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ تو آپؐ نے ان کو کوئی مشرک تعاقب کنندہ خیال کیا۔ اور اس وجہ سے آپؐ دوڑ کر چلنے لگے۔ یہاں تک کہ نعلین مبارک کے آگے والا بند ٹوٹ

گیا۔ اور حضرتؐ کا انگوٹھا شگافتہ ہوگیا۔ جس سے بہت سا خون بہا مگر پھر بھی آپ دوڑتے جاتے تھے۔ تب ابوبکرؓ کو خوف ہوا کہ حضرتؐ کو اس سے بھی زیادہ تکلیف و صدمہ نہ پہنچے۔ تو ابوبکرؓ نے اپنی آواز بلند کی تو حضورؐ ان کو پہچان کر کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ ابوبکرؓ بھی آ گئے اور ساتھ ساتھ چلے اور رسول اللہ صلعم کے پاؤں سے خون جاری تھا یہاں تک کہ صبح ہوتے تک غار تک پہنچے۔" (تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۴ مطبوعہ مصر)

عقلی ثبوت اصلی واقعہ تو یہ ہے جس کی صورت تبدیل کر کے خود ساختہ حکایات و خرافات کے رنگین نقاب چڑھائے گئے اور ایسی ہی رنگ آمیزیوں کی وجہ سے کتب سیر پر صحیح بخاری کو ترجیح دی گئی۔ بخاری صاحب کو حقائق کی حفاظت سے کیا غرض ہو سکتی تھی۔ انہیں تو استحکام عقائد منظور تھا۔ بہر حال ہم نے احادیث کی صحیح کتب اور تاریخوں کی ماں سے ستر اہد پیش کئے جس سے ہر شخص بآسانی اصل حقیقت معلوم کر سکتا ہے۔ یہ معروضات نقلاً ہدیۂ قارئین کئے گئے۔ اب عقلی گذارش سماعت فرمایئے۔

کوئی بھی صاحب عقل سلیم انسان یہ یقین نہیں کر سکتا ہے کہ ایسے آڑے وقت میں جبکہ حضورؐ پر کفار نے عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا اور آپؐ کے قتل کے لئے پانچ قبائل سے بیرحم قاتل منتخب ہو چکے تھے۔ دولت کدہ کا محاصرہ کیا جا چکا تھا کہ حکم ہجرت نازل ہوتا ہے۔ ایسے تنگ وقت پرخطر حالات میں رسول اللہؐ کو کہاں فرصت ہو گی کہ وہ حضرت ابوبکر کے گھر تشریف لے جائیں اور وہاں مشورت فرمائیں۔ چنانچہ اب تنگیٔ وقت کا ثبوت ملاحظہ کریں۔

"جب کفار نے مشورہ کیا (قتلِ آنحضرتؐ کا) تو حضرت جبرئیلؑ نے آ کر خبر دی کہ آج کی رات جہاں آپؐ سوتے ہیں وہاں نہ سویئے۔ کیونکہ خدا نے اسی وقت آپ کو مدینہ جانے کا حکم دیا ہے۔ اسی وقت آنحضرتؐ

نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ ہماری خوابگاہ پر سو رہو۔ اور ہماری چادر اوڑھ لو۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ پھر سرکارؐ وہاں سے باہر نکل آئے۔ اور ایک مٹھی خاک ان لوگوں پر ڈالی (جو بیت الشرف کا محاصرہ کئے ہوئے تھے) خدا نے اُن کی بینائی معطل کر دی وہ آپؐ کو تشریف لے جاتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ اور آنحضرتؐ آیت انا جعلنا فی اعناقھم اغلالاً ——— لایبصرون تلاوت فرماتے ہوئے نکل گئے" (معالم التنزیل)

یہ تفسیری بیان ثابت کرتا ہے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے پاس گنجائشِ وقت ہرگز نہ تھی اور وقت نزول حکم ہجرت بظاہر آپ کو اس کی خبر نہ تھی۔ لہٰذا یہ دفعۃً حکم کسی مشاورت و صلاح و بندوبست کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آپؐ اسی وقت علیؑ کو اپنے بستر پر سلا کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ پس لوگوں کی افسانہ تراشیوں کو اس وقت کی حالتِ اضطراب اور عالمِ انتشار، حکم الٰہی کے فوری نزول اور اس کی فوری تعمیل کی مصلحت سے کوئی ربط حاصل نہیں ہے۔ اب ہر صاحبِ صحیح الدماغ اندازہ کر سکتا ہے کہ جس امرِ عظیم کو مدبّرِ قدرت نے اس استحفاظ و رازداری سے پوشیدہ رکھا ہو کہ وقتِ نزولِ حکم تک بظاہر اس کی اطلاع رسول امینؐ کو نہ کی ہو، اور فوری تعمیلِ حکم کی تاکید فرمائی ہو وہ رازِ عظیم اس بے پرواہی و بے باکی اور آزادی سے طشت از بام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ پس یہ ملمع سازیاں اور افسانہ نگاریاں صرف حضرت ابوبکر کی مدح سرائی اور مرتبہ افزائی کی خاطر کی گئی ہیں ورنہ ان موضوعات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

سورۂ انفال میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

"جس وقت کافر لوگ تم سے مکر کرتے تھے کہ تم کو قید کر لیں یا قتل کر دیں یا خارج البلد کر دیں اور وہ مکر کرتے تھے اور خدا ان کے مکر کا جواب دیتا تھا اور وہ بہتر جواب دینے والا ہے ماکرین کا۔"

کفار کے جوابِ مکر میں جب خیر الماکرین اس عجلت و سرعت کے ساتھ اپنی حکمت و تدبیر کو عمل میں لا رہا ہے تو پھر اس وقت اتنی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے کہ حضورؐ حضرت ابوبکر کے پاس جا کر صلاح مشورہ کریں۔ یا سامانِ سفر درست کریں۔ بلکہ تدبیرِ الٰہی کا مدّعا تو اسی قدر تھا کہ بسترِ مبارک پر علیؑ کو سُلا کر بیت الشرف سے جلد از جلد نکل جائیں اور آئندہ کے تمام معاملات کو اللہ کی تدبیر کے حوالہ فرما دیں۔ یہی شانِ رسالتؐ تھی اور ایسا ہی ہوا جیسا کہ صاحب معالم التنزیل نے لکھا ہے:

"حضرت علیؑ کو اپنا قائم مقام کیا۔ کہ جو امانتیں حضورؐ کے پاس لوگوں کی تھیں ان کو ادا کر دیں۔ کیونکہ آنحضرتؐ کی صدق و امانت پر اعتبار کر کے لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوا دیا کرتے تھے۔ اور مشرکین فرشِ علیؑ کا پہرہ دے رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہی نبیٔ خدا ہیں۔ جب صبح ہوئی تو سب کفار ادھر متوجہ ہوئے چادر اٹھائی تو دیکھا علی ہے۔ پوچھا تمہارے صاحب کہاں گئے۔ فرمایا ہم نہیں جانتے تو سب لوگ حضرتؐ کا نشان لگاتے ہوئے چلے اور لوگوں کو حضرتؐ کی تلاش میں روانہ کیا۔" (معالم التنزیل)

اب قرآن اور تفسیر دونوں کی عبارات آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو روایت بخاری سے ملا کر دیکھئے تو صاف ظاہر ہو گا کہ اس واقعہ کے متعلق تفسیر قرآن کی عبارت مکرِ کفار کے جواب میں صرف تدبیرِ الٰہی اور ایثارِ علیؑ کے واقعات بیان کرتی ہے۔ جبکہ بخاری صاحب حضرت ابوبکر کے قصیدے سُنا رہے ہیں۔ واقعہ کی حقیقت کو چھپائے جاتے ہیں اور تمام و کمال واقعات میں حضرت امیر علیہ السلام کی ان عدیم المثال اور فوق الکمال خدمات کا ذکر تک نہیں کرتے۔ کیا یہ عداوتِ حیدرِ کرارؑ نہیں تو اور کیا ہے؟

امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر میں تحریر کرتے ہیں کہ "جب

علیؑ ابن ابی طالب شب ہجرت فرش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سوئے تو حضرت جبرئیلؑ بغرض محافظت آپ کے سرہانے تھے اور میکائیلؑ پائنتی۔ جبرئیلؑ ندا کرتے تھے۔ مبارک ہو! مبارک ہو! کون ہے مثل تیرے اے فرزند ابو طالب! کہ خدا تیری ذات سے مباہات کرتا ہے۔ فرشتوں پر پھر آیت ومن یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ نازل ہوئی۔ (تفسیر کبیر)

اسی طرح امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ جناب امیرؑ فرش پیغمبرؐ پر سوئے تو خدا نے حضرت جبرئیلؑ و میکائیلؑ پر وحی کی کہ ہم نے تم دونوں کو بھائی بنایا اور ایک کی عمر کو دوسرے سے طولانی کیا۔ اب کون تم میں ایسا ہے جو اپنی جان کو دوسرے پر فدا کرتا ہے دونوں نے زندگی ہی کو پسند کیا۔ تو پھر خدا نے وحی بھیجی کہ کیوں تم مثل علی بن ابی طالب کے نہیں بن جاتے کہ ہم نے انہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مواخات قائم کی تو آج علیؑ نے اپنی جان کو ان پر نثار کر دیا ہے۔ اور ان کی حیات کو اپنی حیات پر اختیار کر لیا ہے۔ اب تم دونوں زمین کی طرف جاؤ اور ان کی حفاظت کرو۔ حضرت جبرئیلؑ سرہانے آکر کھڑے ہوئے اور میکائیل پاؤں کی طرف آکر کھڑے ہوئے اور پکارتے تھے۔

کوئی شخص ہو سکتا ہے مثل تمہارے اے علی بن ابیطالب کہ خداوند عالم تمہارے سبب فرشتوں پر مباہات کرتا ہے۔ اور یہ آیت نازل کی کہ آدمیوں میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو اپنی جان کو رضائے الٰہی کے لئے بیچ ڈالتا ہے اور خدائے تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ (تاریخ الخمیس جلد اول ص ۲۶۷)

اس مقام پر ہمیں ذکر فضائل و مناقب حیدریہ کا بیان مقصود نہیں بلکہ صرف قارئین کی توجہ اس ستم ظریفی کی جانب مبذول کرانا ہے کہ امام بخاری صاحب کیسے ایماندار اور دیانت دار محدث ہیں کہ جو واقعہ متواترات سے ہے یعنی حضرت علی کا فرش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سونا اور آیت ومن یشری کا نازل ہونا اور جس پر تمام واقعہ ہجرت کا دارومدار ہے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور جو واقعہ قطعاً خلاف واقعہ ہے اور خاص آپ کا خود تراشیدہ ہے۔ اس کو اپنی صحیح میں مختلف رنگوں سے بھر دیا ہے۔ یہ خود غرضی، جانبداری اور طرفداری کی بدترین مثال ہے۔

اسنادِ روایت

روایت بخاری میں واقعہ سراقہ ابن شہاب سے مروی ہے۔ جبکہ امام بخاری ابن شہاب کے وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ لہذا انہوں نے کس طرح ان سے سن لیا۔ چنانچہ شارح بخاری امام ابن حجر عسقلانی نے شرح کرتے ہوئے اس اعتراض سے کتراتے ہوئے مجبوراً لکھ دیا ہے کہ اوپر بیان کردہ اسناد ہی اس واقعہ کے لئے سمجھ لی جائیں۔ لیکن یہ جواب قطعاً بے دلیل ہے۔ پس یہ روایت منقطع ہے۔ اس لئے اسناد کے اعتبار سے بے مقدار قرار پاتی ہے۔

خیانت

نقص سند کے بعد اب ایک اور خیانت ملاحظہ کریں۔ مترجم صحیح بخاری مذکورہ کی ہوشیاری و چالاکی دیکھیے کہ عربی عبارت "اِنَّمَا هُمْ اَهْلُكَ" کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "یہاں تو صرف آپ کی گھر والی ہیں"۔ جو قطعاً غلط ہے۔ حالانکہ قدیم مترجمین نے اس کا ترجمہ یہی کیا ہے کہ "سب آپ کے اہل ہیں"۔ اب چونکہ یہ بات خلاف واقعہ تھی اس لئے کہ حضرت عائشہ سے تو نکاح ہو گیا تھا وہ زوجہ کی تعریف کے اندر آ چکی تھیں مگر اسماء بنت ابوبکر اہل میں کس طرح داخل ہو سکتی ہیں۔ لہذا بخاری کی غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے صیغہ جمع کا ترجمہ واحد صیغہ میں کر دیا گیا ہے۔ جبکہ دراصل

حضرت ابوبکر کے خطاب سے بخاری کا نقل کردہ جواب زیادہ تعجب انگیز ہے۔ حالانکہ علما محدثین کے دیگر اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے کبھی ان الفاظ میں آپ کو جواب ہی نہیں دیا۔ یہ امام بخاری کی حضرت ابوبکر کی زائد از ضرورت مدح سرائی ہے جس نے ممدوح کی عظمت کو بڑھایا نہیں بلکہ گھٹایا ہے۔ جبکہ روایات ہشام ابن عروہ وغیرہ میں حضرت ابوبکر کے الفاظ یہ ہیں۔ "وھما ابنتای" میری دونوں بیٹیاں ہیں۔ جو ہر طریقہ و قرینہ سے بالکل مناسب جواب تھا۔ کہ تہذیب و شرافت اسی جواب میں جھلکتی ہے۔ ہشام بن عروہ اور دیگر راویانِ حدیث کی حدیثیں کچھ بھی روایت بخاری سے معقول نظر آتی ہیں جبکہ بخاری کی قلمکاریاں صرف حضرت ابوبکر کی رسوخیت اور حیثیت عائشہ کی خصوصیت کے اظہار پر مبنی ہیں لیکن افسوس کہ وہ بھی پوری نہ ہو سکیں۔ اُن کے جادو کو دوسرے راویوں نے زائل کر دیا۔

اونٹنیوں کا قصّہ

روایت میں مذکور ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر نے کہا ہے میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں میری ایک اونٹنی آپ لے لیجیے۔ یہ ذکر کسی منقبت کا حامل نہ تھا کہ بقول بخاری حضورؐ نے قیمتاً اونٹنی قبول کی تاہم اس کو علمائے اہل سنت نے بڑی شدومد سے ذکر کیا ہے لیکن شارح بخاری جناب ابنِ حجر عسقلانی نے اس پر حاشیہ لکھا ہے کہ ابن اسحاق نے مزید کہا ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا ہم اس اونٹنی پر سوار نہ ہوں گے جو ہمارا مال نہ ہو۔ ابوبکر نے کہا وہ تو آپ ہی کا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا بشرطیکہ وہ قیمت لے لو جس مول پر تم نے خریدا ہے۔ ابوبکر نے کہا ہم نے اس قیمت پر لیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا ہم نے اس دام پر لیا۔ اسی طرح طبرانی نے اسماء بنت عمیس سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ہم صرف قیمت میں لے سکتے ہیں تو ابوبکر نے کہا اگر چاہیے تو قیمت ادا کر دیجیے۔ اسی طرح واقدی نے کہا ہے کہ قیمت آٹھ سو دینار ہوئے اور یہ وہی اونٹنی ہے جس کا نام قصوا ہے۔ لیکن

ابن اسحاق کے مطابق یہ ناقہ جذعا تھی۔ ابن حبان نے بھی اسی سے اتفاق کیا ہے
شیخ عبد الحق محدث دہلوی اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں۔

"حضرت ابوبکر کے دو اونٹ تھے جن کو انہوں نے چار سو درہم یا دوسری روایت کے مطابق آٹھ سو درہم پر خریدا تھا۔ اور چار مہینوں تک چارہ وغیرہ کھلا کر خوب تیار کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس موقع پر دونوں کو حضور کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا میں انہیں قیمت دے کر البتہ قبول کر سکتا ہوں۔ پس نو سو درہم پر آنحضرت صلعم نے ان کو حضرت ابوبکرؓ سے خرید لیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ سے باوجود ان کی رسوخیت و اعتماد اور سابقہ اتحاد و اتفاق اموال وغیرہ بلا قیمت نہیں لیا۔ خرید لینے میں حکمت یہ تھی کہ آنحضرت صلعم نہیں چاہتے تھے کہ خدا کی راہ میں کسی کی مدد اور تعاون قبول کریں چنانچہ آیہ لا تشرک لعبادۃ ربہا احدا یعنی اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو اپنا شریک نہ بناؤ۔ میں اس کی طرف خاص اشارہ موجود تھے۔

(مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۷۴)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی صاحب کی اس عبارت سے اس واقعہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی "شرکت فی العبادۃ" میں انتہائی احتیاط ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا اب ایک طرف قرآنی آیت اور شاہ عبد الحق صاحب کا بیان ملاحظہ کریں تو دوسری طرف بخاری کی روایت جس میں امام بخاری نے حضرت ابوبکر کی ان امورِ عبادت میں شرکت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف فرمایا ہے۔

پس چونکہ آنحضرتؐ جملہ شعبہ ہائے شرک سے حتمی طور پر محفوظ ہیں، لہٰذا اس مسلّمہ اصول کے خلاف آپ نے واقعہ ہجرت میں اس کا خصوصی خرم قائم رکھا اور کسی کو خلافِ آیت اپنا شریکِ کار نہ بنایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ بخاری صاحب کی روایت میں ایک امر مفید بھی مل گیا ہے جس سے ہمیشہ کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابوبکر کے بارِ احسان سے سبکدوشی

حاصل ہو گئی۔ اگر نجاری صاحب اپنی عقیدتمندی میں ادائے قیمت والی شرط بھی گول کر جاتے تو ان کا کیا بگاڑا جا سکتا تھا۔ لیکن اتفاقاً ان کا صاف الفاظ میں یہ شرط سپردِ قلم کر جانا مدیر جیسے طالب علموں کے لئے احسان ہے۔ اُن کے اس اندراج سے کم از کم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استغنا، توکل، صبر و رضا جیسے اوصافِ رسالت ضرور ثابت ہو جاتے ہیں۔ اور شانِ نبوت کا اظہار ہوتا ہے کہ آپؐ نے عالمِ مصیبت و غربت میں، بے یاری و مددگاری کی حالت میں، بے ساز و سامانی کی کیفیت میں بھی یہ گوارہ نہ فرمایا کہ کسی کی اونٹنی بلا قیمت یا مستعار حاصل کر کے راہِ خدا کا راستہ دو قدم بھی طے کیا جائے۔

جس رسولؐ نے اپنے چچا ابوطالبؑ کا بارِ احسان اُن کے فرزند علی علیہ السلام کی پرورش کر کے باقی نہ رکھا حالانکہ بعد از والد یہ بات چچا کے فرائض میں شامل تھی۔ بھلا وہ کیسے کسی ایسے شخص کا احسان قبول کرتا جس کی کوئی امتیازی حیثیت نہ تھی۔ وہ نبیؐ برحق جس نے ایک کرتہ کا احسان جو آپؐ کے چچا عباسؓ کے ساتھ کیا گیا تھا کو اپنے ذمہ باقی نہ رکھا اور اس شخص کو اپنا پیراہن کفن کے طور دیدیا۔ وہ خدا کے خاص کام کے متعلق کسی غیر ممیز شخص کا احسان کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ بہرحال شاہ عبدالحق محدثؒ جیسے کٹر سنی عالم و فاضل کو اس بات کا اقرار ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہ چاہا کہ راہِ خدا میں کسی کی امداد و اعانت کو قبول کریں۔ اس لئے حضرت ابوبکر سے بلا قیمت ناقہ نہ لی۔ تو اس سے یہ بات از خود ثابت ہو گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطیبِ خاطر حضرت ابوبکر کو اپنے ساتھ نہ لیا۔ کیونکہ ساتھ لے کر کسی کو غار میں جانا لا تشرک بعبادة ربہ احدا کا منافی ہے اسلئے کہ یہ تو ایسا شرک ہے جو ان الشرک لا یغفر کا مترادف ہے۔ کیونکہ جس امر کو خداوند عالم نے ایسے راز میں رکھا کہ سوائے رسولؐ کے اور اس کو بھی عین وقت پر

اور کسی کو اس سے آگاہ نہ کیا اس کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ امین رسالت رسولؐ نے اس سرّ الٰہی کو یوں فاش کر دیا ہو گا۔ پس جب اونٹ بلا قیمت قبول کرنا منافی "الشرک لعبادۃ ربہ احدا" سمجھا گیا تو اسی راہِ خدا کے پروگرام میں کسی دوسرے کو بالقصد و ارادہ ساتھ لینا جو توجہ اور استغراق الی اللہ میں مخل ہونے کا سبب بنتا ہے۔ بالکل قرآنی آیت کے مخالف اور منافی حقیقت ہے جس سے ذاتِ رسولؐ مبرّا ہے۔

روایتی لحاظ سے بھی بخاری صاحب کا درج کردہ یہ اونٹوں کا قصّہ غیر مستند ہے کہ روایت کے اس جملے "وعلف راحلتین کانتا عندہ ورق السمرۃ وھو الخبط اربعۃ اشھر" یعنی حضرت ابوبکر نے ان دونوں اونٹنیوں کو چار ماہ تک کیکر کے پتے کھلائے" پر بخاری کے معتقد خاص اور شارح مشہور علامہ ابن حجر عسقلانی نے اعتراضات کئے ہیں پہلا یہ کہ "ورق سمرہ" کی شرح امام زہری نے کی ہے جسے امام بخاری نے جزوِ روایت بنا لیا حالانکہ یہ زہری کا قول ہے نہ کہ بی بی عائشہ یا عروہ کا جو کہ راوی ہیں۔ دوسرا اعتراض ابن حجر یہ کرتے ہیں کہ چار مہینے مدّت جو بیان کی گئی ہے صحیح نہیں کیونکہ عقبہ ثانیہ اور ہجرت آنحضرت صلعم میں دو ماہ یا ایک ماہ کا فرق ہے۔ یہ چار مہینے کہاں سے آ گئے۔

اسی طرح ان اونٹوں کی سودا بازی بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ہم نے اوپر شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی عبارت مدارج النبوۃ سے نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے ان دونوں اونٹوں کی اصل قیمت خرید چار سو درہم یا آٹھ سو درہم تھی۔ اور حضورؐ نے صرف ایک ناقہ نو سو درہم میں خرید فرمایا۔ یعنی اگر وہ دو سو کا تھا حضرت ابوبکر نے چوگنی قیمت سے بھی زیادہ مول لیا اور اگر چار سو قیمت خرید تھی تو قیمت فروخت دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی۔ اب اگر بالفرض حال یہ سمجھ لیا جائے کہ آنحضرتؐ نے دونوں ناقوں کو خرید فرما لیا تو بھی ایک سو درہم

زیادہ ادا کیا۔ کیا کسی ہمدرد دوست کی محبت و دوستی کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وہ وقتِ آزمائش ساعتِ مصیبت میں رعایت و مروّت کی بجائے مالی منفعت کی سودا بازی کرے۔ غالباً ایسا حُسنِ رفاقت اپنی نظیر نہیں رکھتا ہے۔

اونٹنیوں کی یہ سودا بازی ہی اس روایت کی تمام نقاشی کو یک قلم محو کر دیتی ہے کہ اگر رسولِ کریمؐ نے قصداً حضرت ابوبکرؓ کو اپنا ہم سفر بنایا ہوتا تو یہ سودا بازی عین وقت پر ہرگز نہ کی جاتی۔ جبکہ روایت کے اعتبار سے چار ماہ قبل یہ اونٹنیاں صرف اسی مقصد کے لئے حاصل کی گئیں تھیں۔ جب یہ طے شدہ پروگرام تھا تو پھر تنگیٔ وقت کے باوجود عین وقتِ رخصت خرید و فروخت کیسے منعقد ہوئی۔ اونٹنیوں کا یہ سودا ثابت کرتا ہے کہ بخاری کی افسانہ تراشی کو حقیقت سے کوئی ربط حاصل نہیں ہے چنانچہ امام حافظ جلال الدین سیوطی صاحب امام بخاری کی تمناؤں کا خون اس طرح کرتے ہیں:۔

"حضور اکرمؐ اور ابوبکرؓ تین دن تک غار میں ٹھہرے۔ اور عامر بن فہیرہ اُن کے لئے کھانا لاتا۔ اور علیؑ (اس کھانے کا) اس کا بندوبست کرتے رہے۔ پس علیؑ نے تین اونٹ بحرین کے اونٹوں میں سے خریدے۔ ایک راہ نما کو اجرت میں دیا۔ جب تیسری رات کا کچھ حصّہ گذرا تو حضرت علیؑ اونٹ اور رہبر کو ساتھ لاتے۔ ایک اونٹ پر رسول اللہ صلعم اور ایک اونٹ پر ابوبکرؓ سوار ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ (تفسیر درِ منثور جلد ۲ صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ مصر)

پردہ چاک ہوتا ہے

علامہ سیوطی نے بخاری کی موضوعات و مصنوعات پر سے پردہ اٹھا دیا اور حقیقت کھول دی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم قبل از ہجرت نہ ہی حضرت ابوبکر کے گھر تشریف لے گئے۔ نہ کوئی مشورت ہوئی نہ ہی اونٹوں کا کوئی سودا منعقد ہوا۔ نہ ہی حضرت ابوبکر کے گھر سے اُن کی دختر کے آزار بند سے کوئی سامانِ سفر باندھا گیا۔ نہ ہی کوئی رہنما مقرر کیا گیا۔ اور نہ ہی قصداً حضرت ابوبکر کو رفیقِ سفر بنایا گیا۔ بلکہ تمام ضروریاتِ سفر کا

انتظام اُسی نفس فروش کے سپرد کیا گیا جس نے رات کو اپنی جان بیچ کر مرضاتِ خدا خرید لی تھیں۔ اور جو خدا کی راہ میں رازدارِ قدرت ثابت ہو چکا تھا۔ اور جس کی امانت و حمایت میں حضورؐ کی جان اس کے استحفاظ کی اصلی ترکیب اور ہجرت کا راز سپرد کیا گیا تھا۔ اور انھی نے یہ تمام خدمات و انتظامات کئے۔ اور یہ کام بمطابق حکم پیغمبر ہوتا رہا جیسا کہ امام طبری لکھتے ہیں کہ :-

"جب آنحضرتؐ غار کی جانب روانہ ہوئے تو حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ ہم کو کھانا بھیجا کرنا۔ اور ایک راہنما کو اُجرت پر مقرر کرنا جو مجھے مدینہ کی راہ پر لے جائے۔ اور ایک سواری ہمارے لئے خرید لینا۔ یہ ہدایت فرما کر آپ روانہ ہو گئے اور اللہ نے کافروں کو اندھا کر دیا۔

(تاریخ طبری جلد دوم ص۱۲۴ مطبوعہ مصر)

طبری کے بیان نے معاویہ شاہی فرمان اور تعمیل بخاری کی تمام کارستانی کا بھید طشت از بام کر دیا ہے۔

بخاری نے جو واقعہ سراقہ کا بیان کیا ہے۔ کتب تواریخ و سیر میں اس کی حقیقت مشاہدہ کرامت تک ہے۔ کسی مورخ قدیم نے حضرت ابوبکر کی گرفتاری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ مگر حضورؐ کے ساتھ ابوبکر کی گرفتاری کا مشہور کرنا محض حضرت ابوبکر کی اہمیت افزائی کے لئے بخاری کے لئے ضروری ہوا۔ لیکن اس کہانی میں ایک بات بڑے کام کی ہے کہ "عالم پریشانی میں بھی سامان تحریر ساتھ رہتا تھا" اسی طرح عامر بن فہیرہ کا ایسے اضطرابی حالات میں جبکہ لباس بھی جسم پر بھاری معلوم ہوتا ہے۔ قلم دوات ساتھ رکھنا اور امن کا معاہدہ تحریر کرنا بھی قابلِ غور امر ہے۔

عامر بن فہیرہ کون تھے

امام بخاری نے عامر بن فہیرہ کو صرف غلام ابوبکر ظاہر کیا ہے لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ غلامی کے علاوہ بھی عامر کو حضرت ابوبکر سے خاص تعلق تھا کہ ان کی والدہ حضرت

ابوبکر کی مرتبہ زوجیت میں آگئی تھیں اور اس لحاظ سے عامر حضرت ابوبکر کے متبنیٰ بیٹے قرار پاگئے تھے۔ چنانچہ امام طبری لکھتے ہیں کہ:-

عامر بن فہیرہ اصلاً قبیلہ ازد کے آدمی تھے اور طفیل بن عبداللہ بن سنجرہ کے بیٹے تھے۔ ان کی کنیت ابوالحارث تھی۔ یہ حضرت عائشہ بنت ابوبکر اور عبدالرحمان بن ابوبکر کے بھائی تھے کیونکہ ان کی ماں ایک تھی۔ جب مسلمان ہوئے تو حضرت ابوبکر نے ان کو خرید فرمایا۔ پھر آزاد کر دیا۔ ان کا اسلام مستحسن شمار ہوتا ہے۔

(تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۲۳۶ مطبوعہ مصر)

پس جب ہم صحیح بخاری کی مرویات کو ناقدانہ انداز سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت واقعہ ہجرت کا بیان نہیں ہے بلکہ خاندان حضرت ابوبکر کا منثور قصیدہ ہے۔ ہجرت کے تمام واقعات کو نظر انداز کر کے صرف حضرت ابوبکر کے لئے سرنجاب کے پر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تعجب ہے کہ مکہ اور مدینہ کے اس سفر میں آنحضرتؐ نے کم از کم سولہ منازل پر قیام فرمایا مگر بخاری نے ان کا ذکر تک کرنا مناسب خیال نہ کیا جو اصل مضمون سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ علامہ طبری نے اپنی تاریخ میں ابن سعد نے اپنی طبقات میں ان منازل کے نام گنوائے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) خرر (۲) ثنیۃ المرۃ (۳) القفف (۴) مدلجہ (۵) مرجح
(۶) حیدایدہ (۷) اذاخر (۸) رابغ (۹) ذا اسلم (۱۰) عثانیہ
(۱۱) قاحۃ (۱۲) عرج (۱۳) حدادت (۱۴) رکوبۃ (۱۵) عقیق
(۱۶) جثجاثہ۔

الغرض ہم اب موضوعات بخاری کے خس و خاشاک کو مزید صاف کر کے کتاب کی ضخامت کو بڑھانا نہیں چاہتے اور نفس مضمون کو آگے بڑھاتے ہیں کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوبکر کے ہمراہ غار ثور میں رات کے آخری حصہ میں داخل ہوئے۔ وہ تمام روایات جن میں آنحضرتؐ کے

خوفزدہ ہونے کا بیان ہے ہمارے نزدیک ناقابلِ اعتبار ہیں کیونکہ وحی الٰہی کے ذریعہ حضورؐ کو حفظِ جان کا یقین دلایا جاچکا تھا۔ بہرحال آپؐ حضرت ابوبکر کے ہمراہ غار میں داخل ہوئے اور اپنے رب کی رفاقت و حمایت پر پورے اعتماد کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اُدھر خانہ رسولؐ کو محصور کیے ہوئے کفار پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ایک دم خوابگاہ پیغمبر پر ٹوٹ پڑے۔ اور اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے جونہی بستر پر سے چادر کو ہٹایا تو رسولؐ کی جگہ وصیٔ رسولؐ کو پایا۔ کھسیانے ہوکر پوچھا تمہارے صاحب کہاں گئے۔ جواب ملا "لا ادری" کیا تم میرے سپرد کر گئے تھے جو پوچھتے ہو؟ صحیح نسائی کے مطابق حضرت علیؑ پر تیر بھی چلائے گئے۔ اور طبری کا بیان ہے کہ یہ جواب سُن کر وہ سیخ پا ہوگئے اور انہوں نے حضرت علی کو گرفتار کر لیا۔ اور خانہ کعبہ میں کچھ دیر حراست میں رکھ کر چھوڑ دیا۔ دیگر محدثین و مورخین نے کئی روایات اس مضمون میں نقل کی ہیں مگر بخاری نے اسے شجرِ ممنوعہ سمجھا ہے۔ گو کہ روایات میں عبارتی اختلاف موجود ہے مگر مدعا میں سب متفق ہیں۔ کہ استقلال امیر علیہ السلام اور کمال رازداری۔

سید اولاد حیدر فوق بلگرامی اعلی اللہ مقامہ نے اپنی کتاب "سراج المبین فی تاریخ امیر المومنین" جلد اول میں اس استقامت و پاداری کے سلسلہ میں بڑی عمدہ بحث کی ہے اور انبیاء سابقین اور امم ماضین کے حالات سے ایک موازنہ ترتیب دیا ہے۔ حواری عیسیٰ یہودہ عسکریوتی کی غداری کی مثال اور پطرس و شمعون کی عدم استقامت کی مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی جانثاری منفرد و ممیز مقام رکھتی ہے۔

بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چار دن غار میں مقیم رہے۔ اور حسب حکم پیغمبر حضرت امیرؑ علیہ السلام ان دنوں متواتر آب و طعام نہایت رازداری اور ہوشیاری سے پہنچاتے رہے۔ اس کے بعد ہدایت رسول کے مطابق سواری کے اونٹ

وقت مقررہ پر پہنچا دیئے گئے اور حضور ابو بکر کے ہمراہ مدینہ روانہ ہوئے۔ واقعہ ہجرت کے خاص خاص واقعات ہم مختصراً مختلف معتبر کتب اہل سنت سے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ہجرت کے خاص واقعات

جب خداوند علیم نے اپنے رسولؐ کو حکم ہجرت کیا تو اس وقت حضرت علیؑ ۲۲ سالہ پُر شباب نوجوان تھے۔ ایذا اور تکالیف قریش انتہائی حد تک پہنچ چکی تھیں لہٰذا ۱۶ ار جولائی ۶۲۲ء یعنی لعبثت کے تیرہویں سال کے آغاز میں یہ واقعہ پیش آیا۔ ابوسفیان و ابوجہل وغیرہ نے اسکیم تیار کی کہ سوتے میں رسولؐ پر حملہ کر کے ان کا کام تمام کر دیا جائے۔ خدا نے جبرئیل کے ذریعے اپنے رسولؐ کو باخبر کیا۔ مخالفین ارادہ قتل کی خاطر آپؐ کے مکان کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے ایک مٹھی خاک پر سورہ یٰسین کی آیات پڑھ کر کفار کی طرف پھینکی اور ان کی بینائی مفقود ہوگئی۔ لہٰذا آپؐ صاف بچ کر نکل گئے۔ جناب علی المرتضیٰ کو اپنے بستر استراحت پر سبز چادر اوڑھ کر سونے کا حکم دیا۔ حضرت علیؑ بے خوف و خطر سو رہے۔ کفار و مشرکین ہتھیار سنبھالے پہرے پر معمور رہے اور پتھر پھینکتے رہے۔

(روضۃ الصفا جلد ۲ صـ ۵۵)

خدا نے فرشتوں کو حضرت علیؑ کی حفاظت پر موکل کیا۔ اللہ نے آسمان پر مباہات کی اور حضرت علیؑ کی جانفروشی کی تعریف میں یہ آیت نازل فرمائی کہ

ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات اللہ و اللہ رؤف بالعباد (سورہ بقر پ۲) یعنی اور بعض لوگوں میں سے وہ ہے جو اپنی جان کو خدا کی رضامندی کے لئے بیچتا ہے اور اللہ بندوں پر شفقت فرمانے والا ہے۔ (معارج النبوۃ رکن چہارم صـ ۳۔ تفسیر کبیر جلد ۲ صـ ۲۸۳)

جب رسول خدا نے ہجرت فرمائی تو حضرت امیر لباس رسول میں ملبوس بستر نبوت پر سوئے۔ حضرت ابو بکر آئے اور ان کو نبی اللہ سمجھ کر آواز دی۔
(تذکرہ خواص الامتہ ص۲۱، تاریخ حبیب السیر جزو سوم جلد ۱ ص۲۴ روضتہ الصفا جلد ۲ ص۵۵، تفسیر روح المعانی جلد ۱ ص۳۹۹۔ احیاء العلوم روضتہ الاحباب، کفایت الطالب وغیرہ)

علی الصبح کفار تلواریں کھینچ کر گھر میں گھس آئے۔ جناب امیر بستر سے اٹھنے لگے مشرکین نے پوچھا محمد کہاں ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا خدا بہتر جانتا ہے جہاں ہیں خدا کی پناہ میں ہیں۔ کفار حیران ہوئے۔ شرمندہ ہو کر حضرت علی کو گرفتار کر لیا اور بعد میں ابو لہب کے اشارہ پر انہیں چھوڑ دیا گیا۔ (معارج النبوۃ رکن چہارم ص۱۱، مطالب السؤل ص۳۶، روضتہ الصفا جلد دوم ص۵۵)

قریش نے جناب علی کو مارا، برا بھلا کہا، اور کعبہ میں لا کر محبوس کیا، بعد میں چھوڑ دیا۔ (تاریخ الخمیس جلد اول ص۳۲۵، روضتہ الصفا جلد ۲ ص۵۵ سوانح عمری پیغمبر اعظم ص۲۰۴، تاریخ طبری، ارجح المطالب وغیرہ)

اشعار مرتضوی

جناب امیر المومنین علیہ السلام نے اس شب ہجرت پر چند اشعار تصنیف فرمائے جن کو علمائے اہل سنہ نے یوں نقل کیا ہے۔

وقیت بنفسی خیر من وطی الحصا ۔۔۔ ومن طاف بالبیت العتیق وبالحجر
رسول اللہ خاف ان یمکروا بہ ۔۔۔ فنجاہ ذو الطول الالہ من المکر
فبات رسول اللہ فی الغار آمنا ۔۔۔ موقی وفی حفظ الالہ وفی ستر
اقام ثلاثا ومت قلائص ۔۔۔ قلایص یفرین الحصی ایرما تفر
وبت اراعیھم ما یثبتوننی ۔۔۔ فقد وطنت نفسی علی القتل والاسر
الردت بہ نصر الالہ تبتلا ۔۔۔ واحزنہ اوسدنی قبر

معارج النبوۃ رکن چہارم ص۳، تفسیر ثعلبی، ارجح المطالب، مدارج النبوۃ

جلد ۲ صفہ ۸ مواہب الدنیہ، روضۃ الاحباب، تاریخ الخمیس مناقب امیرالمومنین وغیرہ)

ترجمہ:- میں نے اپنی جان کے عوض میں اس عالی منزلت شخص کو بچایا جو پاؤں سے پتھروں یا کنکروں کے روندنے والے اور خدا کے پرانے گھر اور اس جگہ کے طواف کرنے والوں اور حجراسود کے بوسہ دینے والوں سے افضل ہے۔ خدا کے رسولؐ کو اندیشہ ہوا کہ دشمن ان کو نقصان نہ پہنچائیں گے۔ پس خدا نے جو بڑا قدرت والا اور صاحب فضل و بزرگ ہے۔ اپنے پیغمبرؐ کو اُن کے شر سے بچالیا۔ پس اللہ کے رسول نے غار میں امن و سلامتی سے رات کاٹی۔ دشمن سے بچانے والے خدا کی حفاظت اور حجاب قدرت میں تین دن وہاں غار میں مقیم رہے۔ پھر ناقوں کو مہاریں دی گئیں۔ جو ایسے تیز رفتار تھے کہ سطح سنگ اور کنکریوں کو روندتے چلے جاتے تھے۔ اور میں نے دشمنوں کے حملے کے انتظار میں رات کاٹی اور مجھے گھائل بھی نہ کر سکے اور نہ قیدی رکھ سکے کیونکہ بے شک میں قتل و قید سے ڈرنے والا نہ تھا کہ یہ میری جبلّی عادت ہے۔ میں نے ہر چیز سے قطع نظر کر کے محض خدا کے دین کی امداد خلوص نیّت سے کی ہے۔ اور آئندہ بھی یہی ٹھان لیا ہے کہ جب تک قبر میں تکیہ لگا کر نہ لیٹوں اس عزم پر مصمّم رہوں"۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو غارِ ثور کی طرف نکلے تو حضرت ابوبکر بھی جناب علیؑ سے آپؐ کا پتہ معلوم کر کے تعاقب میں گئے۔ جب تک حضورؐ غار کے قریب پہنچ گئے تو آہٹ سُنی اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی دشمن پکڑنے والا نہ ہو۔ جب ابوبکر نے کھنگھورا تو حضرتؐ نے پہچان لیا۔ رُکے اور دونوں مل کر آگے روانہ ہوئے۔ ملاحظہ کریں۔

(دلائل النبوۃ ابن مردویہ تفسیر درمنثور جلد ۳ صفہ ۲۴۱ تاریخ طبری جلد ۲ صفہ ۱۴۴)

قرآن مجید نے اس واقعہ کو ان مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"ثانی اثنین اذ ھما فی الغار۔ اذ یقول لصاحبہ لا

تحزن ان اللہ معنا۔ فانزل اللہ سکینتہ علیہ ایدہ بجنود لم
تروھا۔

یعنی اُسی اللہ نے اپنے رسول کی مدد اس وقت بھی کی جب کافروں نے
اس کو ایسا بے سروسامان گھر سے نکال باہر کیا کہ صرف دو آدمی اور دو میں
دوسرے رسولؐ اس وقت غار میں اپنے ساتھی کو تسلّی دے رہے تھے کہ کچھ رنج
نہ کرو۔ ڈرو مت اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر اللہ نے اپنے پیغمبرؐ پر اپنی
طرف سے تسلّی نازل کی اور ان کی فرشتوں کی ایسی فوج سے مدد کی جس
کو تم لوگ نہ دیکھ سکے۔

کفّار و مشرکین مکّہ نے حضورؐ کی تلاش شروع کر دی۔ تمام اطراف میں
لوگوں کو دوڑا دیا۔ جنگل، پہاڑ، ریگستان ڈھونڈ مارے۔ آخرکار جبل ثور پر
چڑھ آئے۔ جب حضرت ابوبکر نے اُن کے پاؤں کی آہٹ سُنی تو
ڈر گئے۔ آنسو بہانے لگے۔ حضور نے فرمایا "لاتحزن ان اللہ معنا"
مت خوفزدہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن جب کفار نے قدرت کا
یہ بندوبست دیکھا کہ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تنا ہوا ہے۔ کبوتری
نے انڈے دیئے ہیں۔ اور درخت خاردار پیدا ہو چکا ہے تو کہنے
لگے اس غار میں اگر کوئی چھپا ہوتا تو یہ جالا ٹوٹ جاتا۔ انڈے
محفوظ نہ ہوتے۔ مایوس ہو کر واپس لوٹے۔ (ملاحظہ کریں معارج النبوۃ
رکن چہارم صـ۶، روضۃ الصفا جلد ۲ صـ۵۶، تاریخ الخمیس جلد ۱
صـ۳۲۶، روضۃ الاحباب جلد ۱ صـ۶۸، تفسیر کبیر جلد ۴ صـ۶۴۳، شواہد
النبوۃ، مدارج النبوۃ۔ وغیرہ وغیرہ)

جب کفار قریش کے پاؤں کی آواز حضرت ابوبکر کے کانوں

میں پڑی تو انہیں سخت گھبراہٹ ہوئی۔ عالم خوف میں بولے ہم یہاں صرف دو آدمی ہیں۔ ہماری ہستی ہی کیا ہے۔ اب ہم ان کے ہاتھوں بچ نہیں سکتے۔ ہمیں تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ پس رسول ہیتین نے ارشاد فرمایا۔ ہم دو نہیں تین ہیں اور وہ تیسرا بہت زبردست ہے۔ آنحضرت کو اپنے قوی و عزیز خدا پر کامل بھروسہ اور اپنی صداقت پر پورا اعتماد تھا۔ لہٰذا اپنے رفیق کی تسلی و تشفی فرمائی۔ ثبوت کے لئے دیکھئے سوانح عمری پیغمبرؐ اعظم ص ۲۰۳۔

حضرت ابوبکر مشرکین تعاقب کرنے والوں کی آواز سے اتنے مضطرب ہوئے کہ تھر تھر کانپنے لگے اور کہنے لگے کہ ہمارے تعاقب کرنے والے بہت زیادہ ہیں اور ہم صرف دو ہی ہیں۔ بہادر و صابر رسولؐ نے فرمایا۔ ڈرتے کیوں ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

(ماخوذ تاریخ الاسلام جلد ۲ ص ۶۸ علامہ عباسی بحوالہ نبوت و خلافت)

جب حضرت ابوبکر نے کفار کو دیکھا کہ غار کے نزدیک آگئے ہیں تو رسول اللہ کے خوف کے لئے رو پڑے یعنی ابوبکر کے آنسو گر پڑے پس آنحضرتؐ نے فرمایا تو نہ ڈر تحقیق اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ پس ابوبکر نے کہا کیا اللہ ہمارے ساتھ ہے؟ جناب رسولِؐ خدا نے فرمایا ہاں۔ پس ابوبکر اپنے رخساروں کے آنسو صاف کرتے تھے۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۶۴۳ مطبوعہ مصر)

جب رسول کریمؐ نے حضرت ابوبکر کی یہ حالت ملاحظہ فرمائی، تو حضورؐ نے فرمایا۔

"اے ابوبکر کیا تو نہیں خیال کرتا کہ ہم دو نہیں ہیں بلکہ تیسرا ہمارے ساتھ اللہ ہے۔" (مسند احمد بن حنبل جزو اوّل صہ۴ مطبوعہ مصر)

سانپ کا ڈسنا

حضرت ابوبکر کی یہ پست ہمتی اور کوتاہ حوصلگی جب ان کے مداحوں کو زمرۂ تنقیص میں دکھائی دیتی ہے تو پھر اپنے ممدوح کی شان افزائی کی تراکیب وضع کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور کیا گیا کہ حضرت ابوبکر خوف کے باعث گریہ زاری نہ فرماتے تھے بلکہ اصل میں غار میں سے ایک سانپ نکل آیا تھا جس نے آپ کو ڈس لیا اور اس شدتِ تکلیف کے باعث آپ گریہ کناں ہوئے۔ اس افسانے کی تلخیص یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر پہلے غار میں داخل ہوئے۔ اس کی صفائی کی۔ غار کے گڑھوں اور سوراخوں کو پُر کیا۔ دو سوراخ بڑے تھے ازار بند پھاڑا دونوں سوراخوں میں اپنے پاؤں ڈال دیئے۔ ان سوراخوں میں سے ایک میں سے سانپ نے ایک پیر پر ڈنگ مار دیا۔ اس تکلیف میں آنسو جاری ہوئے اور رسول اللہ ؐ پر ٹپکے۔ حضور ؐ بیدار ہوئے۔ احوال دریافت کئے۔ اپنا لعاب دہن لگا دیا۔ اچھے ہو گئے۔

(مشکوٰۃ شریف صہ۵۵۶ مطبوعہ مجتبائی دہلی)

یہ مارگزیدگی کا قصّہ روائتی اور درائتی دونوں اعتبار سے ناقابلِ اعتبار ہے۔ کیونکہ ہجرت امرِ الٰہی سے ہو رہی تھی۔ خدا نے حفاظت کا ذمہ لے لیا تھا۔ چنانچہ قلیل مدّت میں مکڑی کا غار کے دہانے پر جالا بننا۔ کبوتری کا انڈے دینا اور خاردار درخت کا اُگنا اس بات کے شواہد ہیں کہ خدا حفاظت کے تمام بندوبست خود کر رہا ہے۔ لہٰذا وہاں سے سانپ کا نمودار ہونا اور اس کا ڈس لینا وعدہ خداوندی کے خلاف ہے۔ جو کہ امرِ محال ہے۔ غارِ ثور اس قدر صاف شفاف ہے کہ اس میں سوراخ نہیں ہے۔

گذشتہ حوالجات کی عبارات میں سوائے دشمنوں کے خوف کے اور کوئی دوسری وجہ نہیں ملتی ہے۔ اور حضورؐ کا خدا کو تیسرا ساتھی بتانا اس بات کا قوی ثبوت ہے حضرت ابوبکر کو اپنی قلت و کمزوری کی وجہ سے گرفتاری یا قتل کا خوف تھا۔

صحاح ستہ میں کوئی ایسی صحیح روایت موجود نہیں۔ ہے جو حضرت ابوبکر سے مروی ہو کہ مجھے غار میں سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ خود علمائے اہل سنۃ نے اس قصّہ پر اعتبار نہیں کیا۔ بلکہ رونے کی وجہ و باعث پر علماء میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں خوفِ جان سے گریہ فرمایا۔ کوئی کہتا ہے سانپ نے کاٹ کھایا۔ کچھ کہتے ہیں کہ خطرہ مال تھا۔ غرض جتنے منہہ اتنی باتیں۔

یہ روایت غیر مستند مجروح اور مقطوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے علماء نے اس کو تحریر کرنا پسند نہیں کیا ہے۔ اگر یہ روایت قابلِ توجہ ہوتی تو علامہ شبلی نعمانی اپنی سیرت میں ضرور اس کا تذکرہ کرتے۔ پس حضرت ابوبکر کا رونا سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اُن کو خطرہ جان و مال محسوس ہو رہا تھا۔ بعض کو جان سے مال زیادہ عزیز ہوتا ہے کہ بندے کو بیٹھ کر روتے ہیں اور دولت کو کھڑا ہو کر۔ شاید اسی لئے حضرت ابوبکر غار کے نزدیک آگئے اور کھڑے ہو کر رونا شروع کیا۔ جیسا کہ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں تحریر کیا ہے۔ اور روایت میں ہے کہ:

حضرت ام المسلمین بی بی عائشہ کہتی ہیں کہ حضرت ابوبکر کے پاس گھر میں نقد پانچ ہزار درہم تھے۔ چلتے دفعہ سب اُٹھا کر لے گئے۔ ابو قحافہ میرے دادا نے کہا ابوبکر نے تم کو سختی و تنگی میں چھوڑ دیا۔ اور تمہارے واسطے کچھ نہ چھوڑ گیا۔ میں نے کہا دادا جان وہ ہمارے واسطے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ جہاں ابوبکر روپیہ رکھتے تھے وہاں میں نے پتھر کے ٹکڑے لا کر رکھ

دیئے اور ان کو کپڑے سے ڈھانک دیا۔ میں نے کہا یہ مال ہمارے واسطے چھوڑ گئے ہیں۔ ابو قحافہ نے کہا غم نہ کھاؤ۔ یہ تمہارے لئے کافی ہے۔
(روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۵۴)

اس روایت اہل سنت کے مطابق یہی خیال قرین قیاس ہے کہ حضرت ابوبکر اپنے مال و جان کو خطرہ میں دیکھ کر مضطرب ہوئے تھے۔

ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ حسب ہدایت رسولؐ جتنے دن رسولؐ غار میں مقیم رہے طعام و خوراک کا بندوبست حضرت علیؑ کرتے رہے اور علامہ سیوطی کی روایت کے مطابق عامر بن فہیرہ کھانا لاتا رہا اور جناب امیرؑ نے تعمیل حکم رسولؐ میں بحرین کے تین اونٹ خرید فرمائے اور وقت مقررہ پر پہنچا دیئے۔ عبداللہ بن اریقط ایک معتمد رہبر بھی حضرت علیؑ ہی کی معرفت اجرت پر مقرر ہوا جیسا کہ مسعودی نے مروج الذہب میں، حسین دیار بکری نے تاریخ الخمیس میں لکھا ہے۔

پس اندریں صورت اصل حقیقت یہی سامنے آتی ہے کہ حضرت ابوبکر پروگرام ہجرت سے لاعلم تھے۔ اور انہوں نے حضرت علی سے آ کر دریافت کیا تو پھر حضورؐ کے تعاقب میں گئے۔ پس حضرت ابوبکر کے گھر سے طعام کا غار ثور جانا، سامان تیار ہونا، اونٹنیوں کا قصہ وغیرہ وغیرہ تمام کا تمام یار لوگوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں۔ تاکہ فضائل مرتضوی کے مقابلے میں حضرت ابوبکر کے مناقب بڑھائے جا سکیں۔ حاجی حکیم ڈاکٹر نذر حسین صاحب صابر جھنگ سیالوی (سابق سنی حنفی) جعفری کربلائی اثنا عشری اعلی اللہ مقامہ نے اپنی کتاب "ثبوت خلافت" میں واقعات ہجرت پر مومنین کے لئے نکات عجیبہ بیان کئے ہیں۔ میں ان براہین صابریہ کو نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

براہینِ صابریہ

۱۔ اس واقعہ شبِ ہجرت سے جناب امیرالمومنین علی المرتضیٰؑ کی کمال شجاعت، جان نثاری، ایثار نفسی، حقیقی قربانی اور خلافت بلا فصل ثابت ہوتی ہے۔ کہ دشمنوں کی تلواروں، نیزوں اور پتھروں کے سایہ کے نیچے رات بسر کی۔ مگر رضائے الٰہی میں اُف تک نہ کی۔ بلا خوف وخطر بسترِ نبوت پر لیٹے رہے۔ معصوم نبیؐ کے بستر مبارک پر معصوم وصی و جانشین ہی سو سکتا ہے۔ ؎

حقدار بھی ہے خویشِ رسولِ امین بھی ہے
سویا جو فرش پر وہی مسند نشین بھی ہے

۲۔ جناب امیر علیہ السلام ہی ہجرت کے مسبب فاعلی ہیں۔ اگر وہ جناب بستر رسالتؐ پر نہ سوتے تو ہجرت ہی نہ ہوتی۔ یہ تمام مہاجرین صحابہ پر جناب امیر علیہ السلام کا احسان ہے۔

۳۔ شبِ ہجرت میں بلا کھٹکے بستر رسولؐ پر سونا اور اپنی جان کو فدا کر کے خداوند کریم کے سپرد کرنا یہ سب سے پہلا موقعہ ہے کہ جو وعدہ جناب علی المرتضیٰؑ نے دعوتِ قریش میں فرمایا تھا اس کو پورا کر دکھلایا۔

۴۔ جناب امیرؑ حضرت عیسیٰؑ کے مشہور حواری "سینٹ پیٹرز" (پطرس) سے ہزار درجہا افضل ثابت ہوئے کہ جس نے جناب مسیحؑ کو خلاف شان لفظوں سے یاد کیا اور پیرو ہونے سے انکار کیا اور اپنی جان بچا کر بھاگ گیا۔ یہوداہ سے کئی درجے بہتر تھے کہ جس نے جناب مسیحؑ کو تیس[۳۰] درہم لیکر پکڑوا دیا۔ مگر جناب سیدنا و مولانا علی المرتضیٰؑ نے اپنی نوجوان عمر میں صداقت، شجاعت، وفاداری و غم گساری کا بین ثبوت دیدیا۔ کفار و مشرکین کے ڈرانے دھمکانے پر رازِ نبوی کو افشا نہ کیا۔ تمام دنیا پر

ثابت کر دکھایا کہ حقیقی غم خوار و جاں نثار ایسے ہوا کرتے ہیں۔ جناب مسیحؑ کے حواری شمعون پطرس اور جناب امیرؑ کی وفاداری کا مقابلہ کرو۔

(الف) یوحنا کی انجیل باب ۱۸ آیت ۲۵ پر ہے۔ شمعون پطرس کھڑا تاپ رہا تھا۔ پس انہوں نے اس سے کہا۔ کیا تو بھی اس کے شاگردوں میں سے ہے۔ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ جس شخص کا پطرس نے کان اڑا دیا تھا اس کے ایک رشتہ دار نے جو سردار کاہن کا نوکر تھا کہا کیا میں نے تجھے اس کے ساتھ باغ میں نہیں دیکھا۔ پطرس نے پھر انکار کیا۔ اور فوراً مرغ نے بانگ دی۔

(متی ۲۶/۷۴، لوقا ۲۲/۵۸)

(ب) حواری یہوداہ اسکریوطی کا جناب مسیحؑ کو پکڑوانا۔ دیکھو یوحنا کی انجیل باب ۱۸ "یسوعؑ یہ باتیں کہہ کر اپنے شاگردوں کے ساتھ قدرون کی نالی کے پار گیا۔ وہاں ایک باغ تھا۔ اس میں وہ اس کے شاگرد داخل ہوئے۔ اور اس کا پکڑوانے والا یہوداہ بھی اس جگہ کو جانتا تھا۔ کیونکہ یسوعؑ اکثر اپنے شاگردوں کے ساتھ وہاں جایا کرتا تھا۔ پس یہوداہ سپاہیوں کی پلٹن اور سردار کاہنوں فریسیوں سے پیادے مشعلوں اور چراغوں اور ہتھیاروں کے ساتھ وہاں آیا۔

(متی ۲۶/۴۷، لوقا ۲۲/۴۷ و مرقس ۱۴/۴۳)

۵۔ جس قدر متانت، تسلیم اور رضا سے جناب امیرؑ نے بہ ہوت کا منظر دیکھا ہو جناب امیرؑ کے معلّم روحانی مقدس معصوم محبوب سبحانی و رسول یزدانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے تجویز کی گئی تھی۔ یہ وصف سوائے ذات بابرکات علی الکائنات علیہ السلام کے کسی دوسرے اصحاب باوفا میں نہیں پایا گیا ہے۔

۶۔ جناب امیرؑ کا قتل ہو جانے کے لئے بے خوف، بلا عذر، بلا جھجک سو رہنا اور ان کی بلند خیالی کی گرفت متذکرہ صدر مہار تخیل سے کہیں بالاتر ہے۔

جسے خاموش سنیئے اور لطف اٹھائیے۔ (الکرار)

۷۔ گو آنحضرتؐ کو معلوم تھا کہ جناب علیؑ کا بال بیکا نہ ہوگا لیکن پھر بھی حضرت علیؑ کی ہمت دیکھنی چاہیئے کہ انہوں نے کس جوانمردی سے معرضِ ہلاکت میں اپنی جان ڈالی منظور کر لی۔ اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے جو وعدہ پیغمبر خدا صلعم کی مدد کے لیئے کیا تھا اس کو سچا کر دکھایا۔
(تاریخ الاسلام عباسی ص۸۱)

۸۔ جناب امیرؑ کا بستر نبوت پر رضائے الٰہی میں سونا اسلام اور بانی اسلام کی ہر حالت میں صداقت و سچائی کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر جناب امیرؑ نہ ہوتے تو ہجرت بھی نہ ہوتی اور کیونکہ باقی صحابہ میں سے کوئی ایسا مرد دلاور نہ تھا اور نہ ہی کسی کو سرورِ عالم صلعم سے زیادہ تقرب حاصل تھا نہ کسی کا خون ملا ہوا تھا۔ اگر کوئی اور صاحب سوتے تو پردہ فاش ہو جاتا۔ یا تو وہ ڈر کے مارے خود ادھ موا ہو جاتا یا کفار مشرکین کو جھٹ نشان و پتہ رسول مقبول کا بتا دیتا۔ دیگر کفار مکہ معظمہ کو طعنہ کا موقعہ مل جاتا کہ واہ کیسا نبی و رسول تھا خود تو خویش و اقارب کو لے کر ہجرت کر گئے۔ اور باقی اصحاب کو جو رشتہ دار نہ تھے خطرے میں ڈال گئے۔ اگر نبی برحق ہوتا تو اپنے کسی رشتہ دار قریبی کو سلا جاتا۔ پس طعن کو دور کرنے اور اپنی نبوت کی صداقت اور اپنے ابنِ عم کو وصی و خلیفہ اللہ بلافصل کے لیئے بستر نبوت پر سلا گئے کہ جس سے نبوت و رسالت کی تصدیق کر گئے۔ کہ آڑے اور مشکل وقت مصیبت میں اپنے عزیز اور حقیقی جاں نثار، وفادار مومن کامل ہی کام آیا کرتے ہیں۔ جناب امیرؑ کی حقیقی قربانی نے جناب سید الابرار احمد مختار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جناب یارِ غار حضرت ابوبکر کو بچا دیا۔ اور دین اسلام کی بنیاد قائم کر دی۔

۹۔ بائیس سال کی عمر میں کفار و مشرکین کے نرغہ میں محصور ہو کر جناب

سیّد المرسلین صلعم پر جان قربان کرنا اور اس اوائل عمر میں بغیر مونس و مددگار مقابلۂ کفار کو تیار رہنا یہ جناب امیر المومنین کے ایمان کی کمالیت اور فطرت امامت اور خلافت بلا فصل کا بین ثبوت ہے کہ سب سے مشکل وقت جان فدا کرنا امر عظیم کو جس پر وہ مامور کئے گئے تھے بلا خوف و خطر انجام دینا سب سے زیادہ جاں نثار، بہادر و وفادار ہی کا کام ہے۔ اس کی شہادت و مثال آج تک کوئی نہ پیش کر سکا۔

۱۰۔ جناب مولانا علی المرتضیٰ کے قتل ہو جانے کے لئے بستر نبوّت پر خوشی خوشی لیٹا رہنا۔ گو ان کا قتل واقع نہ ہوا لیکن زندگی میں رتبہ شہادت و فنا فی الرسولؐ کا حاصل کر لینا ہے۔ کیونکہ اقدام کسی فعل کا ارتکاب کے برابر ہوتا ہے۔

۱۱۔ ایک درجہ شہادت کا تو وہ ہے کہ جو مسلمان جنگ اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر قتل ہو جائے لیکن اس سے بھی بالاتر وہ درجہ شہادت فضیلت رکھنے والا ہے جو کوئی عوض جان بانئ اسلام کے بہ نیت حقیقی اپنا قتل ہو جانا بخوشی گوارہ کرے۔ گو قتل واقعہ ہوا یا نہ ہوا اور اسی درجہ شہادت کے اجر کو اپنی پاک زندگی میں ہی جناب امیرؑ نے حاصل کیا ہے۔ جس کی وجہ سے گویا "ذوالشہادتین" ہیں۔

۱۲۔ جناب امیر علیہ السلام نے اپنی جان پر کھیل کر بطفیل پیغمبر صلعم جناب ابوبکر کی بھی جان بچا کر ان پر احسان فرمایا تھا جسے انہیں ہرگز نہ بھولنا چاہیئے تھا۔

۱۳۔ جیسا اطمینان قلب سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خداوند ایزد منان نے عطا فرمایا تھا ویسا ہی جناب شاہ مردان علیہ السلام کو قلب مطمئنہ حاصل تھا۔ اس لئے وہ شب ہجرت میں نہ ڈرے۔

۱۴۔ بائیس سالہ جوان مکہ شریف کے کچے مکان کے اندر کفار و دشمنوں کے

نرغے میں بلاخوف وخطر اطاعت اللہ واطاعت رسول اللہؐ میں اکیلا سوتا ہے ادھر غارِ ثور میں چالیس (پچاس) سالہ بزرگ اونچے پہاڑ کی چوٹی پر سنگین قلعہ کے اندر پناہ وشوکت صلعم کے باوجود روتا ہے۔ فرمایئے ان دونوں میں افضل وشجاع وبہادر کون ہوتا ہے۔؟

۱۵۔ چونکہ حضرت ابوبکر صاحب چالیس سال تک بت پرستی کرتے رہے اور جاہلیت کے تمام افعال میں مستغرق رہے۔ کفار ومشرکین کے گھر بتوں میں پرورش پائی اور چالیس سال بعد اسلام نے ان کے کفر وشرک کو دور کر دیا تھا۔ مگر ابھی نومسلم ہونے کے باعث اسرار توحید وانوار نبوت کما حقہ، اثر پذیر نہ ہوئی تھی۔ اس لئے ابھی ان کو قلب سلیم حاصل نہیں ہوا تھا۔ کہ باوجود مصاحبت جناب رسالت مآبؐ وحفاظت حقیقی حق تعالیٰ کے وہ ڈرنے لگ گئے۔ اور فرمانے لگے کیا اللہ ہمارے ساتھ ہے؟ گویا اب تک یارِ غار کو اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے اور اس کی معیت کی خبر تک بھی نہ تھی۔ ڈرتے جاتے تھے اور فرماتے تھے۔ اے اللہ کے رسولؐ کافروں نے ہم کو آلیا۔ جس پر "لاتحزن ان اللہ معنا" کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ ادھر مکہ معظمہ میں قریشی الہاشمی نوجوان تن تنہا اکیلا موت کے جنگل میں ہے۔ اُف تک نہیں کرتا اور بڑی خوشی ومتانت ودلیری سے کفّار کو جواب دیتا ہے۔ جس پر ومن الناس من یشری نفسہ ابتغا کا تمغہ عطا ہوتا ہے فرمایئے نورِ عرفان، تزکیہ نفس، ایمانِ کامل وقلبِ سلیم کس کو زیادہ حاصل تھا۔ اور حقیقی خلیفہ و ولیعہد و وفادار یا غم گسار کون ہے؟ ڈرنے والا انسان بہادر اور سلیم الطبع انسان سے افضل نہیں ہو سکتا۔

۱۶۔ نواصب وخوارج وقادیانی حضرت ابوبکر کو معیت غارِ ثور سے افضل الناس بعد النبیؐ شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ لاتحزن کے فرمانِ (خلاف)

سرورِ دوجہاںؐ نے جناب ابوبکر کی بہادری، دلیری، جرأت، حوصلہ، صداقت اور رفاقت پر کافی روشنی ڈال دی ہے۔ افضلیت اس وقت ثابت ہوتی ہے کہ جب کسی دوسرے سے مقابل سے بڑھ کر کام کیا جائے فرمایئے جناب ابوبکر صاحب نے غارِ ثور میں فضیلت کا کون سا کام کیا۔ کیا مورچہ سنبھالے رہے یا تلوار لے کر سینہ سپر ہوئے یا سرورِ عالم صلعم کو تسلّی دی بلکہ اُلٹا غار میں جاکر رونا شروع کر دیا۔ اگر کفار کو معلوم ہو جاتا تو گرفتار ہو جاتے۔ وہ تو خود اپنی جان بچانے کی فکر میں لگے رہے۔ اُلٹا سرورِ عالمؐ کو بہلانا پڑا۔

۱۷۔ ان اللّٰہ معنا سے افضلیت ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ خداوند کریم ہر ایک کا محافظِ حقیقی ہے۔ قرآن شریف میں لفظ "انا" جمع کا صیغہ اکثر تعظیم و عزت کے لئے آیا ہے۔ نحن نزلنا، انا نزلنا، نحن اقرب الیہ من حبل الورید میں ہر ایک فردِ مسلم کو معیتِ خداوندی حاصل ہے اور معنا جمع متکلم کی ضمیر سرورِ دوعالم صلعم کی طرف راجع ہے جس سے مراد گروہ انبیاء مرسلین ہے جیسے السلام علینا و علیٰ عباد اللّٰہ الصالحین تشہد میں ہے علینا سے مراد انبیاء مرسلین ہے پس حضور انور صلعم نے فرمایا کہ اے ابوبکر آپ ڈر نہ کھائیں ہم پیغمبروں کا خدا محافظ و ناصر ہوتا ہے اور حفاظتِ رسالت کے واسطے فرشتے موجود رہتے ہیں۔ اللّٰہ تعالیٰ نے سکینہ یعنی تسلّی و اطمینانِ قلب بھی سرورِ دوعالم پر نازل فرمائی تھی۔

(نوٹ:۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ ما یکون من نجوی ثلثۃ ــــــ ذالک الا ھو معھم۔ یعنی راہ گیروں میں سے نہیں ہیں تین آدمی مگر یہ کہ چوتھا اللّٰہ تعالیٰ ہے اور نہیں پانچ آدمی مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا ہے نہ کمتر ہیں اس سے نہ زیادہ ہیں ان سے مگر خدا ئے

تعالیٰ ان کے ہمراہ ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ تمام کافروں مشرکوں منافقوں مومنوں مسلمانوں کے ساتھ خدا ہے۔ پھر حضرت ابوبکر کو اس "معی" سے کیا خاص فضیلت حاصل ہوئی؟ مشتاق)

۱۸۔ غارِ ثور پہاڑ جبل ثور کے اوپر واقع ہے جو مدینہ منورہ سے ڈھائی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ بندہ صابر مولف کتاب ہذا (ثبوتِ خلافت) اس تاریخی مقام کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے۔ ایک میل کے قریب پہاڑ کی چڑھائی ہے۔ سلطنت ترکی نے راستہ پاٹ دیا ہوا ہے کہ باسانی چڑھ سکتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پہ ایک گول بلند پتھر پڑا ہوا ہے جس کے اندر کھوکھلا سا مقام ہے۔ گویا ایک گنبد ہے۔ ایک طرف کو سوراخ ہے جس کے راستے سرورِ عالمؐ اس جگہ داخل ہوئے تھے۔ مگر سلطنت ترکی نے اس کے دوسری طرف سے بھی راستہ نکال دیا ہے۔ اندر بالکل صاف و شفاف ہے۔ کوئی سوراخ نہیں دو آدمی بخوبی اس میں بیٹھ سکتے ہیں۔ اور پہاڑوں کے دامن میں جو بلی سرنگیں ہوتی ہیں، غارِ ثور اس قسم کی سرنگ نہیں مشکواۃ شریف مطبوعہ مجتبائی دہلی صفحہ ۵۵۶ پر لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر پہلے غار میں گئے۔ سوراخ بند کئے۔ ازار بند پھاڑا اور دو سوراخوں میں اپنے پاؤں ڈال دیئے۔ جب سانپ نے کاٹا تو آنسو بہائے جس پر رسول خداؐ نے بیدار ہو کر پوچھا۔ اور لعاب دہن لگایا کہ وہ اچھے ہو گئے۔ اس کو ناصبی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے جان نثاری کی۔ حالانکہ سانپ سے نہ ڈرے مگر غار کو دیکھ کر ڈر گئے۔ ؎

بس کن کہ حدیثِ غار کر عار است ز عقل ✽ آں خزان بیقراری شیخ معمرم

امام من آنست کہ فرمانش بُردہ مار ✽ من ایں امام مار گزیدہ کجا برم

جناب ابوبکر کو تو غارِ ثور میں سانپ نے کاٹ کھایا جس پر رونے لگے مگر جناب امیر علیہ السلام کا حکم ایک اژدہا نے مانا بتایئے افضل کون ہے؟

معجزۂ اوّل صاحب شواہد النبوۃ والسعد بن ابراہیم اربلی سنی کتاب اربعین میں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب علی المرتضٰی کوفہ میں مصروفِ وعظ تھے کہ ناگاہ ایک شور وغل ہوا۔ دیکھا کہ ایک اژدھا چلا آرہا ہے۔ لوگ خوفناک ہوئے۔ لیکن جناب علی المرتضٰی نے فرمایا کوئی خوف نہ کرے اور اس کو راستہ دے دو۔ اس کو مجھ سے کام ہے۔ چنانچہ وہ اژدھا جناب علی المرتضٰیؑ کے قریب بالائے منبر پہنچا۔ اور اپنا پھن گوشِ مبارک پر لگا دیا پھر جناب امیرؑ نے کچھ کلمات اس کے پھن کے قریب فرمائے۔ وہ فوراً واپس چلا گیا۔ دریافت پر حاضرین سے جناب امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ میں جس طرح تمہارا امام ہوں اسی طرح میری امامت کی معتقد تمام مخلوقِ خدا ہے۔ یہ فلاں شاہ جنّ کا بیٹا ہے۔ اس کے باپ نے آج قضا کی۔ اور یہ اس کا جانشین ہوا ہے۔ مجھ سے بعض امور انتظامی سلطنت کے متعلق بعض حکم چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کو حکم دیا گیا۔ کوفہ میں جو ایک دروازہ **باب ثعبان** مشہور ہے اس کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ اسی راستے سے اژدھا آیا تھا۔ اس زمانہ میں یہ معجزہ دور دور تک مشہور ہو گیا۔

معجزۂ دوم حضرت ابوبکر کو تو سانپ (مار) نے غار میں کاٹ کھایا اور آپ کی رفاقت وصداقت کی پرواہ نہ کی مگر یہاں سانپ واژدھا آلِ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسنین الشریفین علیہما السلام کی حفاظت کرتے تھے۔ سنو! حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ایک وقت ہم جناب رسولِ خداؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ام ایمن نے آکر عرض کی یا رسول اللہ صلعم بہت دن آگیا ہے حسنین الشریفینؑ کہیں گم ہو گئے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا جاؤ بچوں کو تلاش کرو۔ ہر ایک نے اپنے ناک کی سیدھ پکڑلی۔ میں آنحضرتؐ کے ہمراہ گیا۔ ہم نے ایک پہاڑ کے نیچے حسنین الشریفینؑ کو ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے سوتا پایا۔ اور ایک سانپ کو ان پر سایہ کئے ہوئے

دیکھا جس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ حضرت صلعم اس کی طرف دوڑے اور وہ حضرت صلعم کی طرف دوڑا۔ آنحضرت صلعم سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ لوٹ کر ایک سوراخ میں گھس گیا۔ آنحضرت صلعم نے بڑھ کر ان کو جدا کیا اور اُن کے چہرے کے غبار کو پونچھا اور فرمایا میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں۔ تم خدا کے بڑے پیارے ہو۔ پھر آنحضرت صلعم نے ایک کو کاندھے پر دوسرے کو دوسرے کاندھے پر اٹھا لیا۔ میں نے کہا اے صاحبزادو۔ تمہیں مبارک ہو۔ تمہاری سواری کیا اچھی ہے۔ جناب رسولِ خدا صلعم نے فرمایا۔ یہ سوار بھی تو اچھے ہیں اور ان کے ماں باپ ان سے بہتر ہیں۔ (اخرجہ الطبرانی فی الکبیر فی مسانید الحسن ارجح المطالب باب سوم صفحہ ۳۵۷)

۱۹۔ ناصبی و خارجی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر جناب سید البشر صلعم کو کندھوں پر اٹھا کر غارِ ثور تک لے گئے۔ مصنف "حملہ حیدری" اس واقعہ پر تعجب کرتا ہے کہ ایسی طاقت حضرت ابوبکر میں کہاں سے آئی کہ بارِ نبوت کو اٹھا لیا۔ ؎

ابوبکر آنگہ بدوشش گرفت | دے زیں حدیث است جائے شگفت
کہ درکس چناں قوت آمد پدید | کہ بارِ نبوت تواند کشید

حضرت ابوبکر ایک معمر دُبلے پتلے بزرگ جن کے ساتھ بروایت روضۃ الصفا جلد دوم و تاریخ خمیس پانچ ہزار درہم کی تھیلیاں بھی موجود تھیں۔ وہ جناب سردارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیسے مشکل پہاڑ کی چوٹی پر اٹھا کر لے گئے بھلا آنکہ ستر جوان پہلوان کی طاقت جناب رسولخدا صلعم رکھتے تھے۔ یہ یار لوگوں کے دل خوش کن فسانے اور سادہ لوحوں کو پھسلانے کے بہانے ہیں۔ جناب امیر المومنین علی المرتضیٰ علیہ السلام کے مدارج و مہر نبوت پر چڑھ کر خانہ کعبہ کے بت گرانے کے مقابل یہ ترانے ہیں۔ مان لیا کہ ابوبکر بزازی کا کام کرتے تھے اور کپڑوں کی گٹھڑیاں و بنڈل لے کر بازاروں میں پھیری لگاتے پھرتے تھے۔ (تاریخ الاسلام جلد سوم باب دوم صفحہ اول بحوالہ حیواۃ الحیوان) اس واسطے ان کو بوجھ اٹھانے کی

عادت تھی تو اگر سرورِ عالمؐ کو اٹھا لیا ہو تو ان سے کون سی افضلیت ثابت ہوئی۔ بوجھ اٹھانا کوئی فضیلت نہیں۔ اگر خسر نے اپنے داماد کو اٹھایا تو کس پر احسان کیا۔ یہ فطرۃً منصبی فرض تھا۔ مگر یہ نواصب کے جھوٹے ملمع کہانیاں ہیں۔

۲۰۔ فانزل اللہ سکینتہ علیہ۔ اللہ تعالیٰ نے جناب رسولخداؐ پر سکینہ نازل فرمائی۔ تاکہ وہ بھی یارِ غار کے ڈرانے سے نہ ڈر جائیں۔ جنگِ بدر میں اور حنین میں سکینہ تسلّی سید المرسلین اور مومنین پر نازل ہو چکی ہے اور ہمیشہ نصرت و استعانت پروردگار غزوات و جہاد میں مجاہدین مومنین کے شاملِ حال رہی ہے۔ قولہ تعالیٰ ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین وانزل جنودا لم تروہا۔

(ا) عن انس ان ابا بکر حدثہ قال قلت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی الغار وقال مرۃ ونحن فی الغار لو ان احدھم نظر الی قدمیہ لابصرنا تحت قدمیہ قال فقال یا ابوبکر ما ظنک باثنین اللہ ثالثھما (دیکھو مسند احمد حنبل مطبوعہ مصر جزو اوّل مسند ابی بکر الصدیق صلا سطر ۱۲ از اسلامیہ کالج پشاور لائبریری نجاری ۱۲ پ)

ترجمہ:- حضرت انس سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر نے ان سے بیان کیا کہ جس وقت وہ جناب سرورِ عالمؐ کے ساتھ غار میں تھے اور کفار و مشرکین پہنچ گئے عرض کیا یا رسول اللہ اگر ان کافروں سے کوئی اپنے قدموں کی طرف نظر کرے تو ہم کو دیکھ پائے گا۔ جناب سرورِ عالمؐ نے فرمایا اے ابوبکر تیرا کہاں خیال ہے ہم دونوں کیساتھ تیسرا اللہ بھی ہے جو محافظ و ناصرِ حقیقی ہے۔

(ب) غار سے نکلنے کے بعد سفر مدینہ منورہ میں سراقہ بن مالک مشرک نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کیا تو حضرت ابوبکر نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا۔ اتینا یا رسول اللہ فقال لاتحزن ان اللہ معنا۔ یا رسول اللہ صلعم اب ہم پکڑے گئے۔ دشمن آپہنچے۔ آپؐ نے فرمایا کاہے کو

رنج کرتا ہے اللہ ہمارے ساتھ ہے (بخاری مترجم پ ۱۴ ص ۵ مطبع احمدی لاہور)
یہ جناب ابوبکر صاحب کا وسل حزن ہے کہ باوجود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تسلی وتشفی کے پھر بھی آپ کا حزن وغم دور نہ ہوا اور تمام سفر مدینہ میں ڈرتے رہے۔

نکتہ براہین صابرہ تمام ہوئیں۔ یہاں ایک نکتہ پیش خدمت کرتا ہے کہ کتب صحیحہ سنیہ میں روایات موجود ہیں کہ بی بی عائشہ کہتی ہیں کہ اگر رات کی تاریکی میں ہماری سوئی گم ہو جاتی تھی تو ہم اس نور کی روشنی کی مدد سے اس کو تلاش کر لیتے تھے جو پیشانی رسول مقبول میں چمکتا ہے۔ صدیقہ اہل سنت کا یہ بیان اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک روشن ومنور رہتی تھی۔ یعنی عام لوگوں کے مقابلے میں رسول اللہ کی علامت وشناختی نشان یہ تھا کہ آپ کی پیشانی کا نور رات کو اجالا بخشتا تھا اور ظاہر ہے کہ اس علامت سے کفار بھی آشنا تھے۔ لہٰذا جب ساری رات وہ گھر کا محاصرہ کئے رہے، اور پتھر پھینکتے رہے اور حضرت علیؑ کو رسولؐ خدا سمجھتے رہے تو یقیناً ویسا ہی نور چادر میں ڈھکا ہوا اُن کو دکھائی دیتا رہا۔ اسی طرح جب حضرت ابوبکر نے حضرت علیؑ کو رسول سمجھ کر آواز دی اُن کو بھی ویسا ہی نور نظر آیا۔ یہ نظارہ حدیث نور واحدہ یعنی "میں اور علیؑ ایک ہی نور سے ہیں" کا ثبوت پیش کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ رسولؐ کا نائب وہی ہو سکتا ہے جس کا نور ایک ہی ہو۔ اگر ویسی روشنی نہ ہوتی تو کفار فوراً سمجھ جاتے کہ رسولؐ اپنے بستر میں موجود نہیں ہیں لہٰذا تمام کھیل بگڑ جاتا۔ پس حضرت امیرؑ کا رسول اللہؐ کے نور سے ہونا ایسی فضیلت ہے جو کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہ ہو سکی۔

خیمہ اُمِ معبد علمائے اہل سنت واقعہ ہجرت بیان کرتے ہوئے عموماً ہجرت کی اہمیت کو نظرانداز کر جاتے ہیں اور ان کا زیادہ زور محض حضرت ابوبکر کی رفاقت وفضیلت پر صرف ہوتا ہے حالانکہ اس واقعہ

میں ایسے ایسے عجوبات رونما ہوئے جن سے قدرت خداوندی کی نصرت اور تصدیقِ رسالت سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اثبات ملتے ہیں۔ چنانچہ کتب اہل سنۃ کی میں مرقوم ہے کہ جب آنحضرت ؐ، ابو بکر اور رہبر سفر غار سے نکلے تو پہلے دن اس قافلہ کا گذر خیمہ اُم معبد پر ہوا۔ یہ عورت مسافروں کی تواضع داری کے لئے مشہور تھی۔ مسافر وہاں ٹھہر کر استراحت کیا کرتے تھے اور وہ عورت مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی تھی۔ چنانچہ جب یہ مبارک قافلہ اس مقام پر آیا تو پوچھا کہ کوئی چیز کھانے کی دستیاب ہے؟ تو اس عورت نے جواب دیا کہ نہیں اگر کچھ ہوتا تو طلب سے قبل حاضر کر دیا جاتا۔ حضورؐ نے ایک گوشہ میں ایک بکری بندھی ہوئی دیکھی۔ آنحضرتؐ نے دریافت کیا کہ یہ بکری کیوں بندھی ہے۔ اُم معبد نے جواب دیا کہ کمزور ولاغر ہے۔ ریوڑ کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ حضورؐ نے فرمایا اجازت ہے کہ ہم اسے دوہ لیں۔ ام معبد نے کہا اگر دودھ معلوم ہو تو بڑے شوق سے دوہ لیجئے۔ حضورؐ نے بسم اللہ پڑھ کر بکری کے تھنوں کو دستِ مبارک لگایا۔ برتن مانگا جو چھلکنے لگا۔ حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں نے دودھ نوش فرمایا۔ دوسری مرتبہ پھر اس بکری کو دوھا گیا۔ یہ بھی سب نے پیا۔ تیسری دفعہ پھر برتن بھر گیا۔ اور وہ ام معبد کے لئے چھوڑ دیا۔ پس آپ آگے روانہ ہوئے۔ کچھ دیر بعد ام معبد کا شوہر آیا۔ خیمہ میں دودھ کا بھرا برتن دیکھ کر حیران ہو گیا۔ بیوی سے پوچھا یہ دودھ کہاں سے آیا ہے؟ ام معبد نے کہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک متبرک شخص کے قدموں کی برکت کا نتیجہ ہے۔ پس وہ بولا کہ یقیناً وہ صاحب قریش ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ اچھا تم ذرا اس کا حلیہ تو بیان کرو ام معبد نے حلیہ بیان کیا تو سن کر شوہر بولا کہ وہ تو ضرور صاحب قریش ہے میں جا کر اس سے ملاقات کروں گا۔

اسناد کے اعتبار سے ام معبد والی یہ روایت بہت مشہور و متواتر ہے۔ کتب سیر و تاریخ سے لے کر حدیث و تفسیر کی کتب میں بھی درج ہے۔ باوجودیکہ

اس واقعہ سے مآثر رہ عانیت معلوم ہوتے ہیں پھر بھی اہل سنت علماء اس واقعہ کو چھپاتے ہیں اور بیان کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ اور اگر مجبوراً بیان بھی کریں تو قطع و برید کے ساتھ۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ جواب اس بقیہ روایت ہی سے لیجئے۔ چنانچہ علامہ حسین دیار بکری اپنی تاریخ الخمیس میں یہ واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"علامہ زمخشری (صاحب تفسیر کشاف) اپنی کتاب ربیع الابرار میں ہند بنت جون سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلعم میری خالہ ام معبد کے خیمے پر اترے تو آنحضرت صلعم کچھ دیر آرام فرمانے کے بعد بیدار ہوئے اور پانی طلب کر کے ہاتھ دھوئے اور کلی کی اور خیمہ کے گوشہ کی طرف ببول کا ایک چھوٹا سا درخت تھا۔ حضور نے اپنی کلی کا پانی اس پر پھینک دیا۔ دوسرے روز وہ ایک عظیم الشان درخت ہو گیا۔ اور بہت بڑے بڑے پھل اس میں لگے جو ورس کے رنگ کے تھے۔ ورس عرب میں خوشبودار گھاس ہوتی ہے اور کپڑا رنگنے کے کام آتی ہے۔ اس میں عنبر کی خوشبو آتی ہے۔ اس کا مزا مثل شہد کے ہوتا تھا جسے اگر بھوکا کھا لے تو سیر ہو جاتا تھا۔ پیاسا سیراب ہو جاتا تھا۔ اور بیمار شفا پا جاتا۔ اور اگر اونٹ یا بکری اس کے پتے کھا لیتے تو ان کے دودھ کثرت سے ہوتا۔ ہم لوگ اس کو "مبارکہ" کہتے تھے۔ اطراف و جوانب سے لوگ آتے اور اس سے شفا پاتے۔ تبرکاً ساتھ بھی لے جاتے۔ ایک دن صبح مبارکہ کو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے پھول گرنے لگے اور اس کے پتے چھوٹے ہونے لگے۔ اس حالت سے ہم لوگوں کو بڑا خوف معلوم ہوا کہ اتنے میں خبر رحلت جناب رسول خدا صلعم معلوم ہوئی۔ اس کے تیس برس بعد کیا دیکھتے ہیں کہ جڑ سے زوال تک اس میں کانٹے لگ گئے ہیں اور تمام پھل جھڑ گئے ہیں اور اس کی تازگی جاتی رہی۔ اتنے میں شہادت امیر المومنین علی کی خبر موصول ہوئی۔ پھر اس کے بعد اس درخت نے پھل نہیں دیا۔ بلکہ صرف اس کے پتوں سے ہم لوگ فائدہ اٹھاتے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد کیا دیکھا کہ اس درخت

کے سامنے سے تازہ خون جوش مار رہا تھا اور گل پتے اس کے خشک ہو گئے تھے۔ اس اثنا میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت کی خبر ملی۔ اس کے بعد وہ درخت بالکل خشک ہو گیا۔ اور تعجب ہے کہ اس درخت کا قصہ کیوں مشہور نہ ہوا۔ حالانکہ بکری والے قصہ سے یہ بہتر قصہ تھا۔" (تاریخ الخمیس جلد اوّل ص۲۰۸)

ناظرین اب بخوبی سمجھ سکتے تھے کہ اس طویل روایت کو پورا کیوں نہیں سنایا جاتا اور اس کی تلخیص و قطع برید کس لئے ضروری خیال کی جاتی ہے۔ محض اس لئے کہ اس سے فضیلت اہلِ بیتؑ ظاہر ہوتی ہے۔ ہمیں اس چشم پوشی اور مرفوع القلمی پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ بخاری صاحب نے تو شبِ ہجرت حضرت علیؑ کے بسترِ رسولؐ پر سونے تک کا واقعہ بھی درج کرنا گوارہ نہ کیا۔

المختصر اگر حضرت ابوبکر کو محض شبِ ہجرت میں رفیقِ سفر ہونے پر فضیلت پانے کا حقدار سمجھا جائے تو پھر اس رہبر (جو مسلمان بھی نہ تھا) کو اس استحقاق سے کیوں محروم سمجھا جائے۔ پس بحیثیت رہبر اس کو حضرت ابوبکر پر بھی فضیلت حاصل ہو گی۔ بہرحال ہم نے کتبِ اہلِ سنّت میں مندرج روایات کی روشنی میں یہ بات واضح کر دی کہ نہ ہی حضرت ابوبکر سے جناب رسولِ خداؐ نے بسلسلہ ہجرت کوئی مشورہ کیا اور نہ ہی انہیں ساتھ لیا۔ بلکہ امرِ ربّی کے تحت آپ انتہائی رازداری کے ساتھ اللہ کی رفاقت کے بھروسے پر تنہا روانہ ہوئے۔ اور حضرت ابوبکر بعد میں تعاقب کرتے ہوئے اُن سے ملے۔ نہ ہی کوئی اونٹنیوں والا قصہ رونما ہوا اور نہ ہی کسی سانپ نے ڈنگ مارا۔ نہ ہی حضورؐ کو انہوں نے کاندھوں پر اٹھایا بلکہ غار میں خوفزدگی کے عالم میں گریہ کناں ہوئے اور رسولِ مقبولؐ نے اُن کو تسلیاں دیں۔ ایسے حالات میں یہ سفر کی رفاقت اُن کے لئے نہ ہی کسی فضیلت کا سبب ہو سکتی ہے اور نہ ہی منقبت کا۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ واقعہ تنقیص ثابت کرتا ہے۔

تتمہ

کسی شخص کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے سب سے عمدہ معیار "علم" ہے۔ اسی شرط پر خود خداوند علیم نے خلقتِ آدمؑ کے وقت فرشتوں اور آدمؑ میں علم کو معیارِ فضیلت قرار دیا اور حضرت آدمؑ کو علمی لحاظ سے فوقیت پانے کی صورت میں خلافت الٰہیہ کے لئے خود اللہ نے نامزد کیا۔ کائنات کی کوئی وجہ ایسی نہیں مل سکتی جو علم سے افضل قرار پائے۔ کیونکہ جو کچھ بھی ہوگا علم کے ماتحت ہوگا۔ قوت خواہ کیسی ہی ہو علم کے تابع ہوگی۔ یہی وجہ ہے خداوندِ عظیم نے انسان کے اس دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی عالم بالا میں اس مسئلہ کو خود عملاً حل کر دیا۔ لہٰذا جب کبھی کسی کی افضلیت کو جانچنا پڑے تو بہترین بلکہ واحد طریقہ یہ ہے کہ اس شخص کے علمی مقام کی پڑتال کی جائے۔ اگر وہ علمی معیارِ فضیلت پر پورا اتر آئے تو بلاشبہ وہ افضل ہوگا ورنہ نہیں۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے کہ:

"جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں اپنا خلیفہ زمین پر بنانے والا ہوں تو (فرشتوں) نے کہا کیا تو ایسے شخص کو نائب بناتا ہے جو اس (زمین) میں فساد پھیلائے اور خون ریزیاں کرے۔ اور (بنانا ہے تو ہم کو بنا) کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں حمد کے ساتھ اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے جواب دیا کہ جو (مصلحتیں) میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو۔ اور آدمؑ کو تمام اسمائے (کا علم) سکھا دیئے۔ (آدم کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے) (پھر جو نام سکھائے تھے ان کو سامنے کیا) اور فرشتوں سے پوچھا کہ ان کے نام بتلاؤ۔ تب فرشتوں نے عاجزی سے عرض کیا کہ تو پاک و پاکیزہ ہے ہم تو اس کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے جو تو نے ہمیں بتایا ہے۔ بے شک تو بڑا علیم و حکیم ہے۔ پھر آدمؑ سے کہا اے آدمؑ! تم (ان فرشتوں کو) ان کے نام بتلا دو۔ پھر جب آدمؑ نے (فرشتوں کو ان لوگوں

کے) نام بتا دیئے تو اللہ نے (فرشتوں کو خطاب کیا) فرمایا کیوں میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے چھپے ہوئے راز کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم اب ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپائے ہوئے تھے ہیں وہ سب کچھ جانتا ہوں۔" (البقرہ ۳۰ سے ۳۳ آیت ۱/۲)

اس قصہ قرآن نے یہ فیصلہ ناطقہ فرما دیا کہ معیار فضیلت "علم" ہے۔ اور اسی مجلس سے یہ نتائج بھی اخذ ہوئے کہ اللہ نے آدم کو خلیفہ خود بنایا۔ تاج خلافت و کرامت سر پر رکھا۔ علم لدنی سکھا کر فرشتوں پر فوقیت بخشی۔ فرشتوں کی کثرت رائے، مشاورت، اجماع کو قبول نہ کیا۔ شرط عبادت تسبیح و تقدیس نظر انداز کر دی۔ بلکہ محض علمی فضیلت کو معیار و شرط خلافت الٰہیہ قرار دیا۔ جب معصوم مخلوق "قوی گروہ" عابد و زاہد جماعت کا اجماع و مشاورت نہ قبول کی گئی تو پھر غیر معصوم انسانوں کا اجماع، عبادت و زہد اور شوریٰ خلافت میں کیونکر دلیل قابل قبول بن سکتے ہیں۔ پس خلیفہ صرف وہی ہو گا جس کو خداوند متعال خود بنائے اور اس کو تمام لوگوں پر علمی فوق حاصل ہو۔

فرشتے بھی علم ضرور رکھتے تھے تبھی تو انہوں نے آدم کے زمین پر وارد ہونے سے پہلے ہی یہ اظہار کر دیا کہ یہ فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا۔ یعنی معصوم فرشتوں کے فہم و ادراک کے مطابق "خونریزی" اور "فساد انگیزی" خلافت الٰہیہ کی ہرگز دلیل نہیں ہے۔ پس جنگ و جدل، فتوحات ارضی، لشکر کشی اور فسادات ایسے صفات نہیں جو خلافت الٰہیہ کے لیے معیار یا شرائط ٹھہرائے جائیں۔ بلکہ خلیفۃ اللہ اور وصی رسول اللہ وہی بزرگ ہو گا جو علمی لیاقت میں صاحب فضیلت ہو گا۔

پس چونکہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے بڑھ کر سوائے اُن کے مربی سید کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عالم علم لدنی، فاضل کلی، قاضی شریعت محمدیہ اور کوئی نہیں ہے جیسا کہ خود رسول مقبولؐ اور

اصحاب رسولؐ کے فرمودات سے پوری طرح ثابت ہے۔ اس لئے حضرت علیؑ حضرت ابوبکر سے من کل الوجوہ افضل و برتر ہیں۔ اور ہم نے اوپر تحریر کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا علمی سرمایہ آج بھی دنیا میں تمام علمی گوشوں پر سیر حاصل روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے جبکہ حضرت ابوبکر نے اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ پس جب اُن کا علمی مقام ہی نہیں ہے تو پھر وہ حضرت علی علیہ السلام سے افضل کیونکر ہو سکتے ہیں۔ محض ہجرت کا واقعہ اُن کی شانِ فضیلت کے لئے اس لئے کافی نہیں ہے کہ ایک غیر کلمہ گو اس صفت میں برابر کا شریکِ کار ہے بلکہ بڑھا ہوا ہے کہ رہبری پر مامور ہے۔ سورۂ توبہ میں آیت شب ہجرت میں جو لفظ "صاحب" حضرت ابوبکر کے لئے اعزاز سمجھا جاتا ہے تو وہ من گھڑت فضیلت ہے کیونکہ صاحب کا لفظ قرآن میں کفار کیلئے استعمال ہوا ہے اور حضرت یوسفؑ کے ساتھی قیدیوں کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ پس یہ لفظ باعث فضیلت نہیں ہو سکتا۔ حضور اکرمؐ کا "لاتحزن" فرمانا بھی غور طلب ہوگا کہ اگر ابوبکر کا حزن اطاعتِ خدا و رسولؐ کے تحت تھا تو حضورؐ نے امرِ مباح سے منع فرما کر معاذ اللہ نیکی سے منع فرمایا جو کہ ناقابلِ قبول بات ہے۔ پس "لاتحزن" کے الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کا حزن امرِ خیر پر منحصر نہ تھا ورنہ خیر پر ممانعت وارد نہ ہوتی۔ قرآن مجید میں نازل شدہ آیت کے یہ الفاظ اس نزاع و اختلاف کو ختم کر دینے کے لئے کافی ہیں کہ شب ہجرت حضرت ابوبکر کا کردار معیارِ فضیلت یا شرطِ افضلیت قرار نہیں پا سکتا ہے۔ اور اس شب میں حضرت امیر علیہ السلام کا ایثار اور فدائی کردار ہر لحاظ سے حضرت ابوبکر کے کردار سے مستحسن، قابلِ ستائش، لائق صد آفرین اور باعث افضلیت ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ والسلام

عبدالکریم مشتاق